

مکتبہ شریعتی و سنتی خلفاء الراشدين المہدیین

گلہ سگام
چتر سگام



ذی القعدہ ۱۴۳۹ھ / نومبر ۲۰۰۸ء

السنة



علامہ مصطفیٰ ظہیر امن پوری

- ★ ایمان کیا ہے؟
- ★ تبرکات کی شرعی حیثیت
- ★ کیا قہر لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟
- ★ آؤ عمل کریں!
- ★ کوئی صحیح حدیث قرآن کے مخالف نہیں



مکتبہ شریعتی و سنتی، جہلم، پاکستان



www.AhleSunnatPk.com

اہل سنت کون؟

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

تو ام السنہ امام ابو القاسم الاصہبانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ہم آپ کی سنت کو صحیح احادیث کے ذریعے پہچان پاتے ہیں، اہل حدیث سب سے بڑھ کر صحیح احادیث کو تلاش کرتے، ان میں دلچسپی رکھتے اور ان کی پیروی کرتے ہیں، چنانچہ قرآن و سنت سے ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ اہل حدیث ہی اہل سنت ہیں، کیونکہ کسی بھی پیشگی طرف نسبت کرنے والا اس وقت اپنے دعوے میں جھوٹا ہوگا، جب اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی اور ہر کار گیر اپنے پیشے سے متعلق آلے کے ذریعے اپنے پیشے کو ثابت کرتا ہے، مثال کے طور پر جب آپ کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ اپنی دکان کا دروازہ کھولے ہوئے ہو، اس کے سامنے لوہے والی بھٹی اور ہتھوڑا وغیرہ پڑا ہو تو آپ فوراً پہچان لیں گے کہ وہ لوہار ہے، اسی طرح جب کوئی اپنے سامنے سوئی اور قینچی وغیرہ رکھے ہوئے ہو تو پہچان لیں گے کہ وہ درزی ہے، یہی حال باقی پیشوں کا ہے، اس کے برعکس اگر کوئی کھجوریں بیچنے والا خوشبو فروش کو کہے کہ میں بھی خوشبو فروش ہوں، تو وہ کہے گا تو جھوٹا ہے، نیز ہر دیکھنے والا آدمی اس کی تائید کرے گا۔

ہم نے اصحاب الحدیث کو دیکھا ہے کہ وہ احادیث نبویہ کی تلاش میں نکلے، معتبر مصادر سے ان کو لے کر ان کو جمع اور حفظ کیا، ان کی پیروی کی دعوت دی اور ان کے مخالفین پر تنقید کی، ان کے پاس احادیث کا ذخیرہ تھا، لہذا جس طرح بزاز (کپڑا فروش) اپنے کپڑے، کھجور فروش اپنی کھجوروں اور عطرفروش اپنے عطریں کی نسبت سے مشہور ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہ ان احادیث کے ساتھ مشہور (ہو کر اہل حدیث معروف) ہو گئے، جبکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ احادیث صحیحہ کی معرفت اور اتباع سے روگردانی اختیار کیے ہوئے ہیں، احادیث صحیحہ میں بے تکی اعتراضات کرتے ہیں، لوگوں کو ان کی تدوین و اشاعت سے روکتے ہیں، نیز احادیث اور اہل حدیثوں کے لیے نازیبا مثالیں بیان کرتے ہیں۔

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ جو احادیث صحیحہ کو جمع کرنے، یاد کرنے اور ان کی اتباع کرنے کے شائقین ہیں، وہی اہل سنت کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں، کیونکہ علماء کے ہاں سنت کا اتباع صحیح سند والی احادیث نبویہ کو لے کر آپ کے احکام پر عمل اور انہی سے اجتناب کا نام ہے۔ یہ واضح دلیل ہے کہ آراء و اہواء کے متبعین کی بجائے یہی لوگ اہل سنت نام کے مستحق ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ بات تو ایسے ہی ہے، لیکن ہر فرقہ اپنے کی تائید کے لیے دلائل حدیثیہ پیش کرتا ہے، تو اسے ہمارا یہی جواب ہوگا کہ صحیح حدیث کے مقابلے میں ضعیف، متصل کے مقابلے میں مرسل یا مرفوع کے مقابلے میں موقوف سے جت پکڑتا ہے، وہ اہل حدیث کے برابر نہیں ہو سکتا۔ جو فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتا ہے، وہ قطعی دلیل کا متبع ہے اور جو قوی صحیح حدیث سے جت لیتا ہے، وہ کمزور و ضعیف روایت سے جت لینے والے سے بدرجہا بہتر ہے۔

یوں معلوم ہوا کہ صاحب سنت صرف قوی صحیح حدیث کی پیروی کرتا ہے، جبکہ صاحب الرائے صرف اس حدیث

کی پیروی کرتا ہے جو دل کو بھاتی ہے۔“ (المعجمہ : ۲۱۳-۲۱۴)

فقہ السنۃ:

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

عن أبی سعید قال : خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن نتذاكر المسيح الدجال ، فقال : ألا أخبركم بما هو أخوف عليكم عندی من المسيح الدجال ؟ قال : قلنا : بلى ، فقال : الشُّرك الخفَى ، أن يقوم الرجل یصلی فیزین صلاته لما یرى من نظر رجل .

”سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف آئے ، ہم مسیح دجال کے بارے میں باتیں کر رہے تھے ، آپ نے فرمایا ، کیا میں تمہیں اس سے زیادہ خطرناک چیز کے بارے میں نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کی ، کیوں نہیں ، فرمایا ، وہ شرک خفی ہے کہ آدمی نماز میں کھڑا ہو تو دوسرے آدمی کے دیکھنے کی وجہ سے نماز کو خوب سنوار کر پڑھے۔“ (مسند الامام احمد : ۲/۳۸۲، سنن ابن ماجہ : ۴۲۰۴، وسندہ حسن وریج بن عبد الرحمن وثقہ الجسرور)

- ۱..... ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں پر مہربان تھے ، ان کو ایک فتنہ سے آگاہ کیا اور ڈرایا۔
- ۲..... زمین پر بہت سارے فتنے جنم لے لیں گے۔
- ۳..... قرب قیامت مسیح دجال کا فتنہ ظہور پذیر ہوگا۔
- ۴..... دجال کو ”مسیح“ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں ایک حسی عیب یہ ہوگا کہ اس کی دائیں آنکھ ممسوح (بند) ہوگی۔
- ۵..... دجال انسان ہوگا۔

- ۶..... دجال معنوی عیوب دجل وکراور کذب و زور جمعی فتنج صفات سے متصف ہوگا۔
- ۷..... آدم علیہ السلام سے لے کر برپا ہونے والے فتنوں میں فتنہ دجال سب سے بڑا ہوگا۔
- ۸..... اللہ تعالیٰ کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے ، خواہ اس حکمت تک ہماری رسائی نہ ہو سکے۔
- ۹..... اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو فتنوں میں آزماتا ہے۔
- ۱۰..... فتنوں سے خبردار اور بچ کر رہنا چاہیے۔
- ۱۱..... علمائے دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو فتنوں سے آگاہی دیں۔
- ۱۲..... علمی مجالس کا اہتمام ہونا چاہیے۔
- ۱۳..... شرک کی دو قسمیں ہیں ، ایک شرک جلی ، جیسے غیر اللہ کے سامنے کوع و سجود کرنا ، تعظیماً جھکنا وغیرہ ، دوسری قسم شرک خفی ہے ، جس کا تعلق دل سے ہے ، وہ ریا کاری ہے ، سوائے اللہ کے اسے کوئی نہیں جانتا۔
- ۱۴..... دکھاوے کی نماز شرک اصغر یا شرک خفی ہے۔
- ۱۵..... شرک اصغر کبیرہ گناہ اور حرام و ممنوع ہے۔
- ۱۶..... جھوٹی تعریف اور تعظیم کا متنی شرک اصغر میں مبتلا ہوتا ہے۔
- ۱۷..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے بارے میں ریا کاری سے ڈرتے تھے۔
- ۱۸..... بسا اوقات ظاہری حسی فتنہ سے باطنی فتنہ زیادہ مضرت کا باعث ہوتا ہے۔ ۱۹..... شرک ہر صورت میں مذموم ہے۔

- ۲۰..... اللہ تعالیٰ ہر قسم کے شرک سے بیزار اور پاک ہے۔ ۲۱..... اعمالِ صالحہ کے لیے اخلاص شرط ہے۔
- ۲۲..... قلبی اعمال پر بھی پکڑ ہو سکتی ہے۔ ۲۳..... اصلاحِ قلب ضروری ہے۔
- ۲۴..... ظاہرِ باطن کے تابع ہوتا ہے۔ ۲۵..... کبائر کا مرتکب ملتِ اسلامیہ سے خارج نہیں ہے۔
- ۲۶..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کے بارے میں آگاہی اللہ کے حکم سے دی ہے۔
- ۲۷..... مردوں کے خطاب میں عورتیں بھی برابر کی شریک ہوتی ہیں، الا یہ کہ ان کے بارے میں خصوصی حکم جاری ہو جائے۔
- ۲۸..... گناہوں کے مراتب میں تفاوت ہوتا ہے۔
- ۲۹..... اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی ایمان کے لیے باعثِ مضرت ہوتی ہے۔
- ۳۰..... جلوت و غلوت دونوں حالتوں میں کسی عمل کا التزام اس کے ریاکاری سے مبرا ہونے کی دلیل ہے۔



ابو عبد اللہ

اہل شرک کی مثال

فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ﴾ (النسبوت: ۶۱)
 ”ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے علاوہ کارساز بنائے ہوئے ہیں بکری جیسی ہے“

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

”اس مثال میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین کمزور ترین مخلوق ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کارساز بنائے ہیں، لیکن وہ ان سے کمزوری کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکے، جیسا کہ فرمانِ الہی ہے ”انہوں نے مدد کے لیے اللہ کے علاوہ معبود بنائے، لیکن وہ (معبود) ان کی مدد کی استطاعت نہیں رکھتے اور وہ (روزِ قیامت) ان کے سامنے لشکر کی صورت میں حاضر کیے جائیں گے۔“ (نہل: ۷۴-۷۵) ایک مقام پر فرمایا ”انہوں نے اللہ کے علاوہ معبود بنائے تاکہ وہ ان کے لیے طاقت کا سبب بنیں، ہرگز نہیں، بغیر وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے مخالف ہوں گے۔“ (مریم: ۸۱-۸۲) ایک جگہ مشرک قوموں کی ہلاکت کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا ”ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا، بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا، جب اللہ کا عذاب آیا تو ان کے وہ معبودان باطلہ ان کو ذرا بھی نہ بچا سکے، جن کو وہ پکارا کرتے تھے، انہوں نے ان کو ہلاکت کے علاوہ کچھ نہ دیا۔“ (ہود: ۱۸)

یہ چاروں مقامات قرآنی وضاحت کرتے ہیں کہ جو بھی اللہ کے سوا کسی کو قوت، بڑھوتری اور مدد کے لیے کارساز بناتا ہے، اسے اس سے اپنے مقصود کے برعکس نتیجہ حاصل ہوتا ہے، قرآن میں اس طرح کی اور مثالیں بھی ہیں، لیکن شرک کے بطلان، مشرک کے خسارے اور خلاف توقع نتائج کے حصول کی یہ واضح مثال ہے۔“ (کنز العمال: ۲۱)

ایمان کیا ہے؟

غلام مصطفیٰ امین پوری

اہل سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں اور یک زبان ہیں کہ:

الایمان تصدیق بالجنان (ای القلب) و اقرار باللسان و عمل بالارکان .

”ایمان دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء و جوارح کے ساتھ عمل کا نام ہے۔“

ایمان کی یہی تعریف سلف صالحین نے ان الفاظ سے کی ہے: قول و عمل .

”ایمان (دل اور زبان کے) قول اور (دل اور اعضاء کے) عمل کا نام ہے۔“

امام بخاری ایمان کی تعریف میں فرماتے ہیں: وہ قول و فعل۔

”ایمان (دل اور زبان کے) قول اور (دل اور اعضاء کے) فعل کا نام ہے۔“

ان تمام تعریفوں میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ شرع میں عمل کا اطلاق قول و فعل پر بھی ہوتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعریف ایمان میں سلف کی مختلف عبارات کے بارے لکھتے ہیں:

والمقصود هنا أن من قال من السلف: الإيمان قول و عمل، أراد قول القلب واللسان

و عمل القلب والجوارح، ومن أراد الاعتقاد رأى أن لفظ القول لا يفهم منه إلا القول الظاهر أو

خاف ذلك فزاد الاعتقاد بالقلب، ومن قال: قول و عمل ونية، قال: القول يتناول الاعتقاد وقول

اللسان، وأما العمل فقد لا يفهم منه النية، فزاد ذلك، ومن زاد اتباع السنة فلان ذلك كله لا

يكون محبوباً لله إلا باتباع السنة، وأولئك لم يريدوا كل قول و عمل، إنما أرادوا ما كان

مشروعاً من الأقوال والأعمال، ولكن كان مقصودهم الرد على المرجئة الذين جعلوه قولاً فقط،

فقالوا: بل قول و عمل .

”جن اسلاف نے ایمان کو قول و عمل کہا ہے، ان کی قول سے مراد دل و زبان کا قول ہے اور عمل سے قلب و جوارح

کا عمل مراد ہے، جنہوں نے یہ سوچا ہے کہ لفظ قول صرف ظاہری قول کے لیے مستعمل ہے، انہوں نے اعتقاد قلب کا لفظ

بڑھا دیا، جنہوں نے قول، عمل اور نیت سے ایمان کو تعبیر کیا، ان کے ہاں قول اعتقاد اور ظاہری الفاظ دونوں کو شامل ہے، جبکہ

عمل سے نیت کا مفہوم نہیں ملتا، لہذا نیت کا لفظ بڑھا دیا، اتباع سنت کا لفظ اس تعریف میں شامل کرنے والوں کے ذہن میں

یہ توجیہ تھی کہ اتباع سنت کے بغیر اللہ تعالیٰ کو کوئی عمل پسند نہیں آتا، یعنی انہوں نے ہر قول و عمل کو ایمان کہا، سب کا مقصود

مرجہ کار کرنا تھا، جو ایمان کو صرف قول قرار دیتے تھے، سلف نے عمل کو بھی اس میں شامل کر دیا۔“

(مجموع الفتاوى: ۱۷۷/۷)

اہل سنت والجماعت کی اس متفقہ تعریف کے خلاف امام ابو حنیفہ ایمان کی تعریف سے عمل کو خارج کرتے ہیں، جیسا

کہ امام کبیر بن الجراح فرماتے ہیں:

ولقد اجترأ أبو حنيفة حين قال: الإيمان قول بلا عمل .

”ابوحنیفہ نے یہ کہہ کر بڑی جسارت کی ہے کہ ایمان صرف قول کا نام ہے، عمل کا نہیں۔“

(الاستقاء لابن عبد البر: ۱۳۸، وسندہ صحیح)

جناب عبدالحق حقانی دیوبندی ایمان کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

”ایمان فقط تصدیق قلب کا نام ہے۔“ (عقائد الاسلام از عبد الحق حقانی: ۱۳۴)

جو لوگ ایمان کے مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کے اجماع کے مخالف ہیں، ان کو سنی کہلانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

ایمان کا لغوی معنی و مفہوم:

لفظ ایمان باب افعال کا مصدر ہے، اس کے لغوی معنی میں دو مشہور اقوال ہیں:

۱..... اکثر اہل لغت کا کہنا ہے کہ ایمان کا لغوی معنی تصدیق ہے، وہ اس پر اجماع کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، چنانچہ ازہری کہتے

ہیں: اتفق اهل العلم من اللغوية وغيرهم أن الايمان معناه التصديق.

”لغوی اور دوسرے اہل علم کا اتفاق ہے کہ ایمان کا معنی تصدیق ہے۔“ (ترمذی اللغة: ۵۱۳/۵)

اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ فرمان الہی ہے:

﴿وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ﴾ (یوسف: ۷)

”یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ ہماری تصدیق کرنے والے نہیں، حالانکہ ہم

سچے ہیں۔“

یہاں ایمان بمعنی تصدیق ہے۔

۱..... سلف صالحین کے نزدیک ایمان لغت میں دو معانی کے لیے آتا ہے:

(ا) جب ”با“ کے ساتھ ہو تو تصدیق کے معنی میں ہوتا ہے، جیسے فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿أَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾ (البقرة: ۲۸۵)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں نے رب کی طرف سے اپنی طرف نازل ہونے والی کلام کی تصدیق کی۔“

(ب) جب ”لام“ کے ساتھ متعدی ہو تو پھر بات ماننے کی معنی میں ہوتا ہے، جیسے ﴿وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا﴾

(یوسف: ۷) اور ﴿فَأَمِنْ لَهُ، لَوْ طُ﴾ (العنکبوت: ۲۶) میں ہے۔

سلف صالحین نے ایمان کو صرف تصدیق کے ساتھ خاص کرنے کا رد کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ایمان میں اگرچہ تصدیق

بھی شامل ہے، لیکن وہ صرف تصدیق کا نام نہیں، بلکہ اقرار و طمانینت بھی اس میں شامل ہے، ان کا استدلال درج ذیل تین

طرح سے ہے:

(ا) لفظ ایمان ”با“ اور ”لام“ دونوں کے ساتھ متعدی ہوتا ہے، جبکہ لفظ تصدیق یا تو خود ہی متعدی ہوتا ہے یا ”با“ سے۔

(ب) ایمان میں امن، تصدیق اور امانت، تین معانی پائے جاتے ہیں، جبکہ تصدیق میں امن اور امانت کے معانی موجود

نہیں۔

www.AhleSunnatPk.com

۳..... اہل لغت نے اس آیت ﴿وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا﴾ (یوسف: ۱۷) میں ایمان کا معنی جو تصدیق کیا ہے، وہ صحیح نہیں، کیونکہ سلف صالحین نے اس کی تفسیر ”اقرار“ سے کی ہے، نیز یہ تفسیر ”تصدیق“ سے زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ لفظ ایمان جب ”لام“ کے ساتھ متعدی ہوتا اقرار کے معنی میں ہوتا ہے نہ کہ تصدیق کے معنی میں، اس معنی میں تب ہوتا ہے، جب خود بخود متعدی ہو یا ”با“ کے ساتھ متعدی ہو۔

ابو عبد اللہ

عبادت کیا ہے؟

عبادت کی سب سے جامع تعریف حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے کی ہے:

”عبادت ایک جامع لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کے تمام پسندیدہ و محبوب، ظاہری و باطنی اقوال و افعال کو شامل ہے، چنانچہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، سچائی، امانت کی ادائیگی، والدین سے حسن سلوک، رشتہ داروں سے نیکی، وعدوں کو پورا کرنا، نیکی کا حکم، برائی سے روکنا، کفار و منافقین سے جہاد، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور زبردست انسانوں اور جانوروں کے ساتھ بھلائی، نیز دعا، ذکر، قراءت وغیرہ سب عبادات ہیں، اسی طرح اللہ و رسول سے محبت، اللہ کا ڈر، اس کی طرف رجوع، خالص اسی کی عبادت، اس کے حکم پر ڈٹ جانا، اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا، اس کی قضاء و قدر پر راضی ہونا، اس پر توکل کرنا، اس کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب کا خوف وغیرہ بھی عبادات ہیں۔“ (العبدیۃ: ۸)

عبادت کی اقسام:

اس جامع تعریف سے معلوم ہوا کہ عبادت اقوال اور ظاہری و باطنی اعمال سب کو محیط ہے، لہذا عبادت قولی بھی ہیں، عملی بھی ہیں اور اعتقادی بھی، یعنی عبادت دل سے بھی ہوتی ہے، زبان سے بھی اور دوسرے اعضاء سے بھی۔

اعتقادی عبادات: یہ عبادت اس عقیدے پر مشتمل ہوتی ہے کہ تمام مخلوقات اللہ ہی کی تخلیق ہیں، اسی کے پاس تصرف ہے اور اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، نیز صرف وہی ذات اس قابل ہے کہ اس کے لیے محبت، رجاء، خوف، خشوع، رجوع، توکل اور اخلاص کا مظاہرہ کیا جائے، یہی دلی عبادت ہے۔

قولی عبادت: یہ عبادت اللہ و رسول پر ایمان کی گواہی، قرآن کریم کی تلاوت، ہر حال میں ذکر الہی، دعا اور راست گوئی وغیرہ پڑھنا ہے، اسے ہی زبانی عبادت کہتے ہیں۔

عملی عبادت: اس میں طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد فی سبیل اللہ اور اعضائے جسمانی سے صادر ہونے والے واجب و مباح کام شامل ہیں، یہی بدنی عبادت کہلاتی ہے۔

قبولیت عبادت کے لیے دو ضروری شرطیں ہیں: اخلاص اور اتباع سنت۔

متنفل کی اقتدا میں مفترض کی نماز جائز ہے: حافظ ابوبکی نورپوری

دلیل نمبر 1:

عن جابر قال: کان معاذ یصلی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، ثم یتأتی فیئوم قومہ ، فصلی لیلۃ مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم العشاء ، ثم اتی قومہ فأمہم ، فافتتح بسورۃ البقرۃ ، فانحرف رجل فسلم ، ثم صلی وحده وانصرف ، فقالوا له : أنا فقت یا فلان ؟ قال : لا والله ! ولا یتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاخبر نہ ، فأتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال : یا رسول اللہ ! انا أصحاب نواضح ، نعمل بالنہار ، وإن معاذاً صلی معک العشاء ، ثم اتی فافتتح بسورۃ البقرۃ ، فأقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی معاذ فقال : یا معاذ ! أفأتان أنت ؟ اقرأ بكذا ، واقرا بكذا .

”سیدنا جابر بن عبد اللہ الانصاری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز ادا کرتے ، پھر آکر اپنی قوم کی امامت فرماتے تھے ، ایک رات انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے عشاء کی نماز ادا کی ، پھر اپنی قوم کو آکر یہی نماز پڑھائی اور سورۃ بقرہ کی قراءت شروع کی دی ، ایک آدمی نے مڑ کر سلام پھیرا اور اکیلے اپنی نماز ادا کر کے لوٹ گیا ، دوسرے صحابہ نے اسے کہا : کیا تو منافق ہو گیا ہے ؟ اس نے جواباً کہا : اللہ کی قسم ایسا نہیں ہے ، میں ضرور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر آپ کو یہ بات بتاؤں گا ، چنانچہ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر عرض کی : اے اللہ کے رسول ! ہم سارا دن اونٹوں کے ذریعے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں ، معاذ نے آپ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی ، پھر آکر ہمارے پاس سورہ بقرہ شروع کر دی ! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا : اے معاذ ! کیا تو دین سے متنفر کرتا ہے ؟ تو فلاں فلاں سورت پڑھا کر۔“

(صحیح بخاری: ۹۷۸/۱ ع: ۷۰۰ صحیح مسلم: ۸۷۸/۱ ع: ۶۵۰ واللفظ لہ)

امام ترمذی (م ۲۷۹ھ) اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

هذا حديث حسن صحيح والعمل على هذا عند أصحابنا الشافعي وأحمد وإسحاق ، قالوا : إذا أم الرجل القوم في المكتوبة وقد كان صلاحها قبل ذلك ، ان صلاة من ائتم به جائزة واحتجوا بحديث جابر في قصة معاذ وهو حديث صحيح ، وقد وروى من غير وجه عن جابر .

”یہ حدیث حسن صحیح ہے ، ہمارے ساتھیوں (محدثین) کا اسی پر عمل ہے ، ان میں امام شافعی ، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ شامل ہیں ، ان کا کہنا ہے کہ جب ایسا آدمی فرضوں میں لوگوں کی امامت کرے ، جو خود اس سے پہلے وہی نماز پڑھ چکا ہو ، تو اس کی اقتدا کرنے والوں کی نماز جائز ہے ، انہوں نے سیدنا معاذ کے قصہ والی جابر کی حدیث سے دلیل لی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے ، جابر سے اور بھی کئی سندوں سے یہ حدیث مروی ہے۔ (جامع ترمذی نہت حدیث: ۵۸۲)

اب اس حدیث پر محدثین کی تبویب بھی ملاحظہ فرمائیں:

امام ترمذی فرماتے ہیں: باب ما جاء في الذي يصلي الفريضة ثم يؤم الناس بعد ذلك .
 ”ان روایات کا بیان جو اس شخص کے بارے میں آئی ہیں کہ جو فرض پڑھ لیتا ہے، پھر اس کے بعد لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے۔“

امام الانعم ابن خزيمه (م ۳۱۱ھ) لکھتے ہیں: باب اباحة ائتمام المصلّى فريضة بالمصلّى نافلة ، ضدّ قول من زعم من العراقيين أنه غير جائز أن يأتي المصلّى فريضة بالمصلّى نافلة .
 ”اس بات کا بیان کہ نفل پڑھنے والے کی اقتداء میں فرض پڑھنے والے کی نماز جائز ہے، بخلاف کوفیوں کے کہ ان کے خیال میں فرض پڑھنے والے کے لئے نفل پڑھنے والے کی اقتداء ناجائز ہے۔“ (صحيح ابن خزيمة : ۶۴/۲ ، باب : ۱۳۰)
 امام ابن حبان فرماتے ہیں:

ذكر الاباحة لمن صلى جماعة فرضه أن يؤم قوما بتلك الصلوة .
 ”جو شخص باجماعت فرض پڑھ لے، تو اس کا اپنی قوم کو وہی نماز پڑھانا جائز ہے۔“ (صحيح ابن حبان : ۱۶۲/۶ ، ج : ۲۴۰)
 امام ابوداؤد (م ۲۵۵ھ) لکھتے ہیں:

باب امامة من صلى يقوم وقد صلى تلك الصلوة .
 ”اس شخص کی لوگوں کو امامت کا بیان جو وہی نماز پہلے پڑھ چکا ہو۔“ (سنن أبي داود : ۵۹۹)
 امام دارقطنی (م ۳۵۸ھ) کی تبویب یوں ہے:

باب ذكر صلاة المفترض خلف المتنفل . (سنن دارقطنی : ۲۸۷)
 امام تہیجی (م ۳۵۸ھ) ان احادیث پر یوں تبویب فرماتے ہیں: باب الفريضة خلف من يصلي النافلة .
 ”نفل پڑھنے والے کی اقتداء میں فرض پڑھنے کا بیان۔“ (السنن الكبرى للبيهقي : ۸۵/۲)
 حافظ نووی (م ۶۷۶ھ) تم طراز ہیں: باب صحّة صلاة المفترض خلف المتنفل .
 ”اس بات کا بیان کہ متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز صحیح ہوتی ہے۔“ (خلاصة الاحكام از نووی : ۶۹۷/۲)
 امام نسائی کی تبویب یوں ہے: باب اختلاف نية الامام والمأموم .

”امام اور مقتدی کی نیت مختلف ہونے کا بیان۔“

علامہ سندھی حنفی لکھتے ہیں: یرید اقتداء المفترض بالمتنفل . ”امام نسائی کی مراد یہ ہے کہ متنفل (نفل پڑھنے والے) کے پیچھے مفترض (فرض پڑھنے والے) کی نماز۔“ (حاشیة السندی علی النسائی : ۱۰۲/۲)
 محدثین اپنی روایات کو مقلدین سے بہتر جانتے ہیں۔

قارئین کرام! محدثین تو اس حدیث سے متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز کا جواز ثابت کر رہے ہیں، جیسا کہ ان کی تبویب سے عیاں ہے، امام ترمذی کا تبصرہ آپ پڑھ چکے ہیں، اب حافظ نووی کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیں:

فی هذا الحديث جواز صلاة المفترض خلف المتنفل لأن معاذاً كان يصلي الفريضة مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فيسقط فرضه، ثم يصلي مرة ثانية بقومه، هي له تطوع ولهم فريضة، وقد جاء هكذا مصرحاً به في غير مسلم .

”اس حدیث میں متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز کا جواز موجود ہے، کیونکہ سیدنا معاذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فرض پڑھتے تو ان کا فريضة ساقط ہو جاتا تھا، پھر دوسری دفعہ اپنی قوم کو پڑھاتے، یہ سیدنا معاذ کے لئے نفلی ہوتی اور قوم کے لئے فرضی، یہ بات صحیح مسلم کے علاوہ دوسری کتب میں صراحت سے موجود ہے۔“ (شرح مسلم للنووی: ۱۸۷/۱)

حافظ بغوی لکھتے ہیں: وفيه جواز صلاة المفترض خلف المتنفل، لأن معاذاً كان يؤدى فرضه مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم يرجع الى قومه فيؤتمهم، هي له نافلة ولهم فريضة .

”اس حدیث میں نفل پڑھنے والے کی اقتدا میں فرض پڑھنے والے کی نماز کا جواز ثابت ہوتا ہے، کیونکہ معاذ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے فرض ادا کرتے، پھر اپنی قوم کے ہاں لوٹ کر ان کو نماز پڑھاتے، یہ ان کے لیے نفل اور قوم کے لیے فرضی ہوتی تھی۔“ (شرح السنة للبغوی: ۷۴/۲)

حافظ ابن حزم (م ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: وجائز صلاة الفرض خلف المتنفل، والمتنفل خلف من يصلي الفرض، وصلاة فرض خلف من يصلي صلاة فرض أخرى كل ذلك حسن وسنة .
”فرضی نماز متنفل کے پیچھے، متنفل کی فرض پڑھنے والے کے پیچھے اور فرضی نماز پڑھنے والے کے پیچھے کوئی دوسری فرضی نماز جائز ہے، یہ تمام کام اچھے ہیں اور سنت ہیں۔“ (المحلی لابن حزم: ۲۳۲/۴، مسئلہ: ۴۹۴)
موصوف مزید لکھتے ہیں:

ما نعلم لمن ذكرنا من الصحابة رضى الله عنهم مخالفا أصلاً، وهم يعظمون هذا اذا وافق تقليدهم! و قولنا هذا قول الأوزاعي والشافعي وأحمد بن حنبل وأبي سليمان وجمهور أصحاب الحديث .

”ہم نے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ذکر کئے ہیں، ان کا کوئی مخالف بالکل ہمارے علم میں نہیں، جب یہ بات (صحابہ کا اختلاف نہ ہونا) مقلدین کی تقلید کے موافق ہو، تو اسے بڑا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، جبکہ یہاں نظر نہیں آتی۔ جو ہمارا مذہب ہے، وہی امام اوزاعی، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، ابوسلیمان اور جمہور اہل حدیث (محدثین) کا مذہب ہے۔“ (المحلی لابن حزم: ۲۳۲/۴)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: واستدلال بهذا الحديث على صحة اقتداء المفترض بالمتنفل بناء على أن معاذاً كان ينوي بالأولى الفرض وبالثاني النفل .

”اس حدیث سے متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز صحیح ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، کیونکہ معاذ پہلی نماز میں فرضوں اور دوسری میں نفلوں کی نیت کرتے تھے۔ (فتح الباری: ۱۹۵/۲)

گھر کی گواہی:

علامہ سندھی حنفی لکھتے ہیں:

فدلالة هذا الحديث على جواز اقتداء المفترض بالمتنفل واضحة والجواب عنه مشكل جدا وأجابوا بما لا يتم.

”یہ حدیث واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ متنفل کی اقتدا مفترض کے لئے جائز ہے، اس کا جواب بہت ہی مشکل ہے، احناف نے اس کے ناقص جوابات دیئے ہیں۔ (حاشیہ السندی علی النسائی: ۱۰۴/۲)

دیکھیں کہ احناف کے ایک بزرگ علامہ سندھی حنفی کتنے واضح الفاظ میں بتا رہے ہیں کہ اس حدیث سے ابجدیث کا مسلک صاف طور پر واضح ہو رہا ہے اور اس کا جواب دینا مشکل ہے، لیکن اس کے باوجود بعض لوگوں نے اپنے آپ کو اس مشکل میں ڈال رکھا ہے اور طرح طرح کی تاویلات کا سہارا لیا ہے۔

احناف کی تنگدستی:

اس مسئلہ میں ان کی تنگ دستی کا یہ عالم ہے کہ ان کے پاس کوئی صحیح، صریح اور مرفوع روایت تو درکنار، کوئی ضعیف و موضوع روایت بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ جناب انوار خورشید صاحب نے اس مسئلہ کو ”حدیث اور ابجدیث“ میں پیش ہی نہیں کیا، اگر کوئی ضعیف و موضوع روایت بھی ہوتی تو وہ ضرور عنوان قائم کر دیتے، جیسا کہ ان کی ”روایت“ ہے، اس لئے ”میں نہ مانوں“ کے مصداق احناف نے محض صحیح احادیث کو تاویلات کا نشانہ بنانے پر اکتفا کیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ابن ترکمانی حنفی جو کہ راذا سی بات پر امام بیہقی کی تردید اور حدیث میں تاویل کرتے ہیں، حدیث معاذ پر وہ بھی چپ سادہ گئے ہیں، کوئی تاویل نہیں کی۔ (ریسمیس الجوہر النقی: ۵۸/۲)

یہاں آل دیوبند کے ”حکیم الامت“ جناب اشرف علی تھانوی دیوبندی کی عبارت قابل ذکر ہے، فرماتے ہیں:

”اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہو جاتے ہیں کہ اگر قول مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کا ان میں پڑتی ہے، ان کے قلب میں انشراح و انبساط نہیں رہتا، بلکہ اول استنکار قلب میں پیدا ہوتا ہے پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے خواہ کتنی ہی بعید ہو اور خواہ دوسری دلیل قوی اس کے معارض ہو بلکہ مجتہد کی دلیل اس مسئلہ میں بجز قیاس کے کچھ بھی نہ ہو بلکہ خود اپنے دل میں اس تاویل کی وقعت نہ ہو مگر نصرت مذہب کے لیے تاویل ضروری سمجھتے ہیں، دل یہ نہیں مانتا کہ قول مجتہد کو چھوڑ کر حدیث صحیح پر عمل کر لیں۔“ (تذکرۃ الرشید: ۱۳۱)

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

قارئین خود ہی غور فرمائیں کہ اس تھانوی فرمان کے بالکل مطابق جامد مقلدین محض ایک قیاس (کنزور پر قوی کی بناء) کی وجہ سے صحیح و صریح حدیث میں کتنی تاویلات کر رہے ہیں، لیکن ماننے کو تیار نہیں۔

حدیث معاذ پر اعتراضات اور ان کے جوابات:

اس حدیث کے علاوہ بھی کئی احادیث جن کا ذکر آئندہ آئے گا، اس مسئلہ پر صریح طور پر دلیل ہیں، لیکن ہم پہلے اس حدیث نبوی پر کیے گئے بودے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں، بقول حافظ ابن حزم:

واعترضوا فی حدیث معاذ بأشیاء نذكرها ، وان كنا غانين عن ذالك بحديث أبي بكره و جابر ، لكن نصر الحق فضيلة ، و قمع الباطل وسيلة الى الله تعالى .

”احناف نے سیدنا معاذ کی حدیث پر بہت سے اعتراض وارد کئے ہیں، جن کا ہم ذکر کرنے والے ہیں، اگرچہ ابوبکرہ اور جابر رضی اللہ عنہما کی حدیث کی بنا پر ہم ان اعتراضات کے جوابات سے مستغنی ہیں، لیکن (صرف اس وجہ سے ایک ایک کا جواب دیں گے) کہ حق کی نصرت نیکی ہے اور باطل کا قلع قمع اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہے۔“

(المعلی لابن حزم : ۴/۲۲۹)

اعتراض نمبر ۱:

مشہور مقلد جناب محمد سر فراز خاں صفدر دیوبندی حیاتی لکھتے ہیں:

”اس روایت کے کئی جواب ہیں تین امام طحاویؒ اور باقی دوسرے لوگوں نے دیے ہیں، جواب نمبر ۱: امام طحاویؒ لکھتے ہیں: لو ثبت أن معاذًا فعله في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يكن في ذالك دليل على أنه بأمر رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ یعنی یہ کاروائی حضرت معاذؓ کی اپنی رائے سے تھی، نبی علیہ السلام کا حکم نہ تھا۔“ (خزائن السنن : ۲/۲۰۲)

تبصرہ :

امام طحاوی کا اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کیا تھا، تو بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ انہوں نے ایسا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کیا، اس اعتراض کے کئی جوابات ہیں:

- ☆۱ یہ کہنا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بغیر سیدنا معاذ نے ایسا کیا، بلا دلیل ہونے کی وجہ سے باطل و مردود ہے، کیونکہ یہ بھی تو ثابت نہیں کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی مرضی سے ایسا کیا اور ان کے پاس کوئی دلیل نہ تھی۔
- ☆۲ کسی کام کے جواز کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ضروری نہیں، بلکہ آپ کو علم ہو جانے بعد اس پر سکوت اختیار کرنا بھی جواز کی دلیل ہے، جسے اصطلاح میں تقریر کہا جاتا ہے۔

جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی لکھتے ہیں:

وعلى المستدلّ بآبائنا علم النّبي صلّى الله عليه وسلّم بفعل معاذ .
”اس حدیث سے استدلال کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ ثابت کرے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا معاذ کے

اس کام کو جانتے تھے۔“ (اعلاء السنن : ۲/۱۲۵۹)

جناب! یہ لیں، صحیح مسلم کی روایت میں واضح الفاظ ہیں:

وان معاذاً صلی معک العشاء، ثم أتى فافتتح بسورة البقرة.

”(شکایت کرنے والے نے کہا اے اللہ کے نبی!) معاذ نے آپ کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کی، پھر ہمارے ہاں آ

کر سورة البقرہ شروع کر دی۔“ (صحیح مسلم: ۴۶۵)

یہ نص صریح ہے کہ نبی کو اس بات کا پتا چل گیا تھا کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اس کے باوجود

آپ نے ان کو قراءت میں تخفیف کا حکم تو دیا، لیکن اس کام سے منع نہیں فرمایا۔

☆3 قبیلہ بنو سلمہ، جس کی مسجد میں معاذ رضی اللہ عنہ جا کر نماز پڑھاتے تھے، اس میں تیس بیعت عقبہ میں شامل

ہونے والے صحابہ اور تین تالیس بدری صحابی موجود تھے، جیسا کہ حافظ ابن حزم نے ذکر کیا ہے، ان میں جابر بن عبد اللہ، ان

کے والد عبد اللہ، کعب بن مالک، حباب بن منذر، عقبہ بن عامر اور معاذ و معوذ رضی اللہ عنہم موجود تھے، کیا ان سب کی

موجودگی میں یہ کام ہوا اور خلاف سنت ہونے کے باوجود وہ اس پر اعتراض نہ کریں، بھلا یہ ممکن ہے؟ کبھی نہیں، بلکہ یہ تو

صحابہ کا اجماع ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ کام درست تھا، کسی دوسرے صحابی کا اس پر انکار یا اس کا خلاف منقول نہیں۔

حافظ ابن حجر، حافظ ابن حزم سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولا يحفظ عن غيرهم من الصحابة امتناع ذلك، بل قال معهم الجواز عمر وابن عمر و ابو

الدرداء وأنس وغيرهم.

”ان صحابہ کے خلاف دوسرے کسی صحابی سے اس کا منع ثابت نہیں، بلکہ ان کی موافقت میں عمر، ابن عمر، ابودرداء اور

انس رضی اللہ عنہم وغیرہ سے اس کا جواز ثابت ہے۔“ (فتح الباری: ۱۹۶/۲)

حافظ ابن حجر مزید لکھتے ہیں: انهم لا يختلفون في أن رأى الصحابي اذا لم يخالفه غيره حجة.

”مقلدین اس بات میں ہم سے متفق ہیں کہ کسی صحابی کی رائے اس وقت حجت ہوتی ہے، جب دوسرا کوئی صحابی

اس کی مخالفت نہ کرے اور یہاں بھی ایسا ہی ہے۔“ (فتح الباری: ۱۹۶/۲)

اعتراض نمبر ۲:

رہا ”بذل الجمهود شرح أبي داود“ میں جناب خلیل احمد سہارنپوری دیوبندی کا اس جواب پر یہ اعتراض کہ

صحابہ کرام کا سکوت معتبر نہیں، کیونکہ نبی نے معاذ رضی اللہ عنہ کو ڈانٹا اور فرمایا:

لا تكن فتانا، اما أن تصلي معي، وأما أن تخفف علي قومك. (مسند الامام احمد/ ۷۴)

”اے معاذ! لوگوں کو متفر نہ کر، یا تو میرے ساتھ نماز پڑھ یا قوم کو ہلکی نماز پڑھا۔“ (بحوالہ اعلام السنن: ۱۳۶/۲ - ۱۳۶)

تبصرہ:

☆۱ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ باسند صحیح ثابت نہیں، کیونکہ معاذ بن رفاعہ کی لقاء ”رجل من بني سلمة“

سے ثابت نہیں، نہ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ملاقات ہے۔
حافظ ابن حزم لکھتے ہیں:

ان هذا خبر لا يصح، لأنه منقطع، لأن معاذ بن رفاعه لم يدرك النبي صلى الله عليه وسلم، ولا أدرك هذا الذي شكّا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم بمعاذ.

”یہ حدیث صحیح نہیں، کیونکہ اس میں انقطاع ہے، معاذ بن رفاعہ نے نہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ کو پایا ہے، اور نہ ہی اس شخص کو جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تھی۔“ (المعلی لابن حزم: ۴/۲۳۰)
حافظ مزنی لکھتے ہیں: عن رجل من بني سلمة يقال له سليم قصة معاذ بن جبل في الصلوة مرسل.

(تسنيب الكمال: ۱۷۷/۱۸)

حافظ بیہقی بھی کہتے ہیں۔ (مجمع الزوائد: ۷۲/۲)، نیز حافظ ابن حجر بھی رقم طراز ہیں:

و هذا مرسل لأن معاذ بن رفاعه لم يدركه.

”یہ روایت مرسل ہے، کیونکہ معاذ بن رفاعہ نے اس (رجل من بنی سلمہ) کو نہیں پایا۔“ (فتح الباری: ۱۹۴/۲)
لہذا اس سے استدلال باطل ہوا۔

☆۲ ان الفاظ کے معانی میں احتمال آگیا ہے، اگرچہ ان الفاظ سے احناف کا مدعا بہر صورت ثابت نہیں ہوتا، امام طحاوی نے اس سے دونوں میں سے ایک کام کی ممانعت مراد لی ہے، جبکہ حافظ ابن حزم اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے اس سے صرف ”تخفيف في القراءة“ مراد لی ہے، لہذا ان محتمل اور غیر ثابت شدہ الفاظ کی وجہ سے محدثین اور ائمہ دین کی تصریح شدہ صریح و صحیح روایات کیسے چھوڑی جاسکتی ہیں؟

اعتراض نمبر ۳:

جناب محمد سرفراز خاں صفدر دیوبندی حدیث معاذ کے جواب نمبر ۲ کے تحت لکھتے ہیں:

”امام طحاویؒ ہی ۱۹۹ ج ۱ میں لکھتے ہیں: فقد يجوز أن يكون يصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم نافلة ثم يأتي قومه فيصلي بهم الفريضة.

ہو سکتا ہے کہ معاذؒ نبی کے ساتھ نفل پڑھتے ہوں پھر اپنی قوم کے پاس آکر انہیں فرض پڑھاتے ہوں۔“

(هزائن السنن: ۲۰۴/۲)

تبصرہ:

☆۱ احتمالی الفاظ سے استدلال جائز نہیں، کیونکہ صحیح مسلم کے الفاظ ہیں کہ شکایت کرنے والے نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر یوں شکایت کی تھی:

ان معاذًا صلى معك العشاء، ثم أتى فافتتح بسورة البقرة.....

”بے شک معاذ نے آپ کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کی، پھر آکر سورۃ بقرہ کی قراءت شروع کر دی۔“

(صحیح مسلم: ۴۲۵)

لہذا مسلم کے صریح الفاظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ فرض نبی کے اقتداء میں ادا کرتے تھے اور اپنی قوم کے ساتھ نفل ادا کرتے تھے۔

☆۲ امام ابن خزیمہ حدیث معاذ پر یوں تبویب فرماتے ہیں:

باب ذکر البیان أن معاذًا كان يصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم فريضة لا تطوعا كما ادعى بعض العراقيين .

”اس بات کا بیان کہ معاذ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فرض پڑھتے تھے، نہ کہ نفل، جیسا کہ بعض عراقیوں (کو فیوں) نے دعویٰ کیا ہے۔“ (صحیح ابن خزیمہ: ۶۵/۲، باب: ۱۳۱)

☆۳ امام ابن حبان اسی حدیث پر یوں باب قائم فرماتے ہیں:

ذكر الخبر المدهض قول من زعم أن معاذًا كان يصلي بالقوم فرضه لا نفله .
”اس شخص کے قول کا رد کرنے والی روایت جو دعویٰ کرتا ہے کہ معاذ اپنی قوم کے ساتھ نفل نہیں، فرض پڑھتے تھے۔“

(صحیح ابن حبان: ۱۶۳/۶)

☆۴ حافظ بغوی لکھتے ہیں: لأن معاذًا كان يؤدى فرضه مع رسول الله .

”کیونکہ سیدنا معاذ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے فرض ادا فرماتے تھے۔“ (شرح السنہ: ۷۲/۲)

محدثین اپنی روایات کو مقلدین سے تو بہتر جانتے ہیں۔

☆۵ سنن کبریٰ بیہقی وغیرہ میں سیدنا معاذ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

فيصلي بهم تلك الصلاة، هي له نافلة ولهم فريضة.

”معاذ رضی اللہ عنہ اپنی قوم کو وہی نماز پڑھاتے، ان کے لئے یہ نفل ہوتی اور قوم کے لئے فرض۔“

(السنن الكبرى للبیهقي: ۸۶/۲، الأدم للسناقي: ۱۷۲/۱، دار قطنی: ۲۷۴/۱، شرح معانی الآثار

للطحاوي: ۴۰۹/۱، وسندہ صحیح)

ابن جریج جو بالاتفاق ثقہ امام ہیں، انہوں نے سماع کی تصریح کر رکھی ہے۔ دوسرے راویوں کی طرف سے ان الفاظ کا عدم ذکر عدم وجود پر دلالت نہیں کرتا، ثقہ کی ”زیادت“ بالاتفاق مقبول ہے، کیونکہ یہ ثقات کی مخالفت نہیں ہے۔

جناب نیوی حنفی نے آثار السنن میں ان الفاظ کو شاذ قرار دینے کی بڑی سعی کی ہے، حالانکہ وہ خود اسی کتاب میں کئی مقامات پر ثقہ کی ”زیادت“ کو قبول کر چکے ہیں، ایک مقام ملاحظہ ہو:

عبدالله بن الزبير الحميدى ثقة، حافظ، امام، وهو أحد شيوخ البخارى، فزيادته هذه تقبل

جدًا، لأنها ليست منافية لرواية من هو أوثق منه .

”عبداللہ بن زبیر حمیدی ثقہ، حافظ اور امام ہیں، نیز امام بخاری کے استاذ ہیں، لہذا ان کی زیادت ضرور قبول کی جائے گی، کیونکہ وہ ان سے اوّل کی روایت کے مخالف نہیں ہے۔“ (ریکسیس آثار السنن: ص ۱۷ حاشیہ: ۲۷)

جہاں اپنے مطلب کی بات تھی، وہاں نبوی صاحب نے یہ زیادت فوراً ”تقبل جدّاً“ کہہ کر قبول کر لی، لیکن یہاں چونکہ ان کے خلاف تھی، لہذا مثال مٹول سے کام لیا ہے۔

☆۶ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

صلاة في مسجدی هذا خير من ألف صلاة فيما سواه الا المسجد الحرام .

”میری اس مسجد میں ایک نماز، بیت اللہ کے علاوہ، ہر مسجد میں نماز سے ہزار گنا بہتر ہے۔“

(بخاری: ۱۱۹۰، مسلم: ۱۳۹۴)

اتفاقی طور پر اس نماز سے مراد فرضی نماز ہے، کیونکہ نفلی نماز تو بہر حال گھر میں افضل ہوتی ہے۔

کیا صحابی رسول مجنبوی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک ہزار نماز کے ثواب کو ترک کر کے اپنی مسجد میں جا کر صرف ایک نماز کا ثواب حاصل کرتے تھے؟ یقیناً نہیں۔

حافظ ابن حزم مزید لکھتے ہیں:

فليت شعری ، الى من كان يؤخر معاذ صلاة فرضه حتى يصلّيها معه راغبا أن يصلّيها مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ؟ ألا ان هذا هو الضلال المبين ، قد نزه الله تعالى معاذاً عنه عند كل ذي مسكة عقل .

”افسوس ہے! معاذ رضی اللہ عنہ کس کے ساتھ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہو، فرضی نماز پڑھنے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسے ادا نہ فرماتے تھے؟ یہ واضح گمراہی ہے، ہر ذی عقل کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے سیدنا معاذ کو اس سے بچایا ہوا تھا۔“ (المحلی: ۳۷۴)

☆۷ کیا احناف کے نزدیک یہ جائز ہے کہ ایک آدمی جس نے عشاء کی نماز ابھی ادا نہ کی ہو، وہ امام کی فرضی نماز عشاء کے پیچھے نفل کی نیت کر لے؟ جواب ہاں میں ہو ہی نہیں سکتا، بلاشبہ یہ درست نہیں، تو معاذ رضی اللہ عنہ کے ذمے ایسی غلط بات کیوں تھو پتے ہیں؟ فافہم و تدبر۔

اعتراض نمبر ۴:

جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی لکھتے ہیں:

ولو سلم أنها زيادة ثقة فلا شك أنها ليست من كلام رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا من كلام معاذ ، وهذا ظاهر جداً ، فيحتمل أن تكون من كلام ابن جريج أو من قول ابن دينار أو من قول جابر ، فمن أي هؤلاء الثلاثة كان فليس فيه دليل على حقيقة فعل معاذ ، لأنهم لم يحكوا ذلك عنه ، إنما قالوا قولاً على عندهم كذلك ، وقد يجوز أن يكون في الحقيقة بخلافه ، كذا قاله العيني

نقلًا عن الطحاوی .

”اگر اسے ثقہ کی زیادت تسلیم کر لیا جائے تو بلاشبہ یہ الفاظ نہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور نہ ہی معاذ کے، یہ بات بالکل عیاں ہے، لہذا احتمال ہے کہ یہ ابن جریج کی کلام ہو یا ابن دینار یا جابر کا قول ہو، ان تینوں میں سے جس کے بھی یہ الفاظ ہوں، اس میں یہ دلیل نہیں کہ واقعہ معاذ کا یہی فعل تھا، کیونکہ نہ الفاظ انہوں نے معاذ سے نقل نہیں کئے، بلکہ اپنے خیال میں جو بات تھی وہ کہہ دی کہ معاذ ایسا کرتے تھے، ہو سکتا ہے کہ حقیقت اس کے الٹ ہو، یعنی نے امام طحاوی سے یہی بات نقل کی ہے۔“ (اعلاء السنن : ۱۳۵۹/۲ - ۱۳۶۰)

تبصرہ :

☆۱ احناف نے یہاں تک تو کہہ دیا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ الفاظ جابر کے ہوں، لیکن ہم کہتے ہیں کہ احتمال نہیں بلکہ یقیناً یہ الفاظ صحابی رسول سیدنا جابر کے ہی ہیں، ان کو احتمال کی وجہ سے مدرج قرار دینا اور ابن جریج یا ابن دینار کی طرف منسوب کرنا درست نہیں، کیونکہ ادراج کے لئے ٹھوس دلیل ہونا ضروری ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: الادراج لا یثبت بمجرد الدعوی والاحتمال .

”ادراج محض دعوی یا احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا۔“ (فتح الباری : ۹۷/۲ - ۹۸/۲)

☆۲ راوی اپنی روایت کو دوسروں سے بہتر جانتا ہے۔

جناب محمد سر فراز خاں صفدر حیات دیوبندی لکھتے ہیں:

”راوی حدیث خصوصاً جبکہ صحابی ہو، اپنی مروی حدیث کی مراد کو دوسروں سے بہتر جانتا ہے۔“

(أحسن الکلام از صفدر : ۳۶۸/۱)

اسی طرح جناب عینی حنفی نے بھی یہی بات لکھی ہے (عمدة القاری: ۱۶/۴)

چنانچہ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ یہ الفاظ جابر نے محض اپنے فہم سے کہے، (حالانکہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ جابر خود معاذ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے) تو کیا ہوا؟ اسی اصول کے تحت مقلدین کے احتمال پر صحابی رسول کی رائے اور فہم کو ترجیح حاصل ہوگی۔ والحمد للہ

جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی لکھتے ہیں: فالموقوف عندنا حجة .

”موقوف روایت (قول صحابی) ہمارے نزدیک حجت ہے۔“ (اعلاء السنن : ۱۱۰/۲)

جب قول صحابی حجت ہے، تو یہاں کیوں نہیں مانتے؟ حالانکہ کسی صریح روایت یا دوسرے صحابی سے متعارض بھی

نہیں۔

لطیفہ : جناب انور شاہ کشمیری دیوبندی لکھتے ہیں: والوجدان يحكم بأنه مدرج ، لأن في

اسنادہ ابن جریج ومذہبہ جواز اقتداء المفترض خلف المتنفل .

”میرا وجدان ان الفاظ کے مدرج ہونے کا فیصلہ دیتا ہے، کیونکہ اس روایت کی سند میں ابن جریج ہے اور اس کا مذہب متفصل کے پیچھے مفترض کی نماز کے جواز کا ہے (لہذا اس نے اپنے مذہب کی تائید کے لئے الفاظ بڑھا دیے ہیں)۔“
(فیض الباری : ۲۳۶/۲ - ۲۳۷)

دیکھیں کہ دیوبندی صاحب کی کتنی جرأت ہے، انہوں نے حدیث میں اپنی تقلید کے خلاف آنے الفاظ کی تاویل کی خاطر بالاتفاق ثقہ راویوں پر بھی جرحی نشر چلا دیئے کہ انہوں نے حدیث کو اپنے مذہب کے موافق بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ ذرا سا غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ حدیث کو بدلنے کی کوشش امام ابن جریج نے نہیں کی، بلکہ یہ مقلدین کا ہی حصہ ہے کہ صحیح احادیث کو بھی اپنی عقل اور وجدان کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیتے ہیں، بقول اشرف علی تھانوی صاحب جب کوئی آیت یا حدیث ان کے قول مجتہد کے خلاف آئے تو۔۔۔

نیز باقر کشمیری صاحب ابن جریج کا یہی مذہب ہے، تو ہماری بات کو مزید تقویت مل گئی، کیونکہ مقلدین بھی مانتے ہیں کہ راوی حدیث اپنی حدیث کو دوسروں سے بہتر جانتا ہے۔

اعتراض نمبر ۵:

جناب محمد سرفراز خاں صفدر دیوبندی حیاتی جواب نمبر ۳ کے تحت لکھتے ہیں:

”امام طحاوی ص ۱۹۹ ج ۱ میں لکھتے ہیں: لا حتمل أن يكون ذلك من رسول الله صلى الله عليه وسلم في وقت ما كانت الفريضة تصلى مرتين، فذلك قد كان يفعل في أول الاسلام حتى نهى عنه النبي صلى الله عليه وسلم .

”احتمال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ اجازت اس وقت ہو، جب فرض دوم مرتبہ پڑھائے جاتے تھے، کیونکہ شروع اسلام میں ایسا کیا جاتا تھا، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔“ (خزانة السنن : ۲۰۴/۲)

تبصرہ :

۱..... احناف مجبور ہو کر مان گئے ہیں کہ سیدنا معاذ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے فرض پڑھے تھے، لیکن اب ایک اور بلا دلیل دعویٰ کر دیا ہے۔

۲..... صحابہ کرام ایک نماز کو فرض سمجھ کر دو مرتبہ ادا کرتے تھے، جھوٹا دعویٰ اور بہتان ہے، کیونکہ جو روایت طحاوی (۲۲۱/۱) کے حوالہ سے پیش کی جاتی ہے، وہ سخت ضعیف ہے۔ اس لیے کہ:

۱..... قتادہ کی تدلیس موجود ہے، جناب عینی حنفی لکھتے ہیں: ان فتادة مدلس لا يحتج بعننته الا اذا ثبت سماعه .
”فتادہ مدلس ہیں، ان کے عنعنہ سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی، جب تک سماع کا ثبوت نہ ملے۔“

(عمدة القاری : ۲۶۷/۱)

۲..... خالد بن ایمن کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع و لقاء ثابت نہیں، مدعی صحت پر دلیل لازم ہے، لہذا اس سے استدلال مردود ہے۔

ربا امام طحاوی کا ابن عمر کی مرفوع روایت: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی أن تصلّی فريضة فی يوم مسرتین (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فرض کو ایک ہی دن میں دو دفعہ ادا کرنے سے منع فرمایا۔) (ابو داؤد: ۵۷۹۰، نسائی: ۸۶۱۰، طحاوی: ۲۲۰، وغیرہ) سے یہ استدلال کرنا کہ صحابہ کرام پہلے ایسا کرتے تھے، پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، کیونکہ فالنہی لا تكون الا بعد الاباحۃ۔ (نہی ہمیشہ جواز و اباحت کے بعد ہی ہوتی ہے)، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ضروری تو نہیں کہ جس کام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم منع فرمائیں، وہ پہلے جائز ہو اور صحابہ اسے کرتے ہوں، مثال کے طور پر: عبد اللہ بن یزید الانصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن النهی والمثلة .

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاکہ ڈالنے اور مثله کرنے سے منع فرمایا۔“ (بخاری: ۵۵۱۶)

تو کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبی سے پہلے اسلام میں ڈاکہ ڈالنا اور مثله کرنا جائز تھا اور صحابہ کرام ایسا کیا کرتے تھے؟ نعوذ باللہ! ڈاکہ اور مثله تو کسی دور میں بھی جائز نہیں رہا۔

لہذا جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ شروع اسلام میں صحابہ کرام فرض دومرتبہ پڑھتے تھے، اس پر صحیح و صریح دلیل پیش کرنا لازم ہے

اعتراض نمبر ۶:

جناب محمد سر فراز خاں صفدر دیوبندی حیاتی جواب نمبر ۴ کے تحت لکھتے ہیں:

”قاضی ابوبکر ابن العربی عارضۃ الاحوذی ص ۶۶ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ حضرت معاؤذ بن کی نماز آپ کے ساتھ پڑھتے، پھر رات کی نماز قوم کو پڑھاتے، یعنی جو نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھتے وہ اور ہوتی اور جو قوم کو پڑھاتے وہ اور ہوتی۔“ (خزائن السنن: ۲۰۴/۲)

تبصرہ:

صفدر صاحب کی جانب سے یہ انتہائی فضول اعتراض ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں صریح الفاظ ہیں:

كان يصلي مع رسول الله صلى الله عليه وسلم العشاء، ثم ينصرف، فيأتي قومه فيصلّي بهم تلك الصلوة .

”سیدنا معاؤذ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کرتے، پھر لوٹ کر اپنی قوم کو وہی نماز پڑھاتے۔“

(صحیح مسلم: ۴۶۵)

قاضی ابن العربی المالکی نے اگر تمام یہ بات کہہ بھی دی ہے، تو صفدر صاحب خود اسے خطا سمجھنے کے باوجود کیوں نقل کرتے ہیں؟ کیا صفدر صاحب ”ایمان“ سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ تو جہہ معتبر ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے، تو صاف ظاہر ہے کہ تقلید ناسدیدا اور احادیث نبوی کے انکار نے ان کو ایسے پراکسیا ہے۔

اعتراض نمبر ۷:

جناب صفدر مزید لکھتے ہیں:

”بعض فقہاء احنافؒ نے یہ جواب دیا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ عبارت یوں ہے: فصلی لیلۃ مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم العشاء . (مسلم: ۱۸۷/۱) اس میں عشاء سے عشاء اولیٰ یعنی مغرب مراد ہے، جیسا کہ روایت ترمذی میں مغرب کی تصریح ہے اور ان معاذ بن جبل کان یصلی مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء الآخرة ثم یرجع الی قومہ فیصلی بہم تلک الصلوة . (مسلم: ۱۸۷/۱) اس میں عشاء سے عشاء مراد ہے، والمراد بتلک الصلوة مثلہا فی طول القراءة وغیرہا۔۔۔ الخ (معارف: ۱۰۴/۵) نہ یہ کہ یعنی وہی نماز ہے۔“

(خزائن السنن: ۲۰۴/۲ - ۲۰۵ - مزید دیکھیں حاشیہ فیض الباری: ۲۲۹/۲)

تبصرہ :

قارئین! ذرا غور فرمائیں کہ تقلید نے مقلدین کو حدیث کے خلاف ایسے ایسے اعتراضات نقل کرنے پر مجبور کر دیا ہے، جو خود ان کے ہاں بھی مقبول نہیں، خود جناب صفدر صاحب پچھلے صفحہ پر بالذکر یہ ثابت کرائے ہیں کہ حدیث معاذ میں لفظ مغرب صحیح نہیں، معلول ہے، ذرا ان ہی کی زبانی یہ اعتراف ملاحظہ فرمائیں:

”فائدہ : لفظ مغرب معلول ہے، المعروف السنن: ۲۵۵ میں ہے: قال البیهقی فی معرفة السنن والآثار: أن لفظ المغرب معلولة بتصريح العشاء فی سائر الروایات . (باقی روایات میں عشاء کی تصریح آ جانے کی وجہ سے لفظ مغرب معلول ہے) اور مبارکپوری تحفة الاحوذی: ۱/۴۰۴ میں لکھتے ہیں: وفی رواية مسلم (۱۸۷/۱) عشاء الآخرة (صحیح مسلم کی روایت میں عشاء الآخرة کے الفاظ ہیں) (خزائن السنن: ۲۰۲/۲)

لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا!

صفدر صاحب سے سوال ہے کہ یہ ”فائدہ“ آخر ہے کس کیلئے ہے؟ اور صفدر صاحب کو اس ”فائدے“ نے ”فائدہ“ کیوں نہیں دیا؟ اس کو محض تعصب اور اندھی تقلید کا نام نہ دیا جائے، تو اور کیا کہا جائے؟

جب لفظ مغرب ہی معلول ہو گیا تو مذکورہ بالا دعویٰ خود ہی مردود ہو گیا، رہی یہ بات کہ تلک الصلوة سے مراد وہی عشاء کی نماز نہیں، بلکہ مقدار قراءت وغیرہ میں اس کی مش ہوتی تھی، تو یہ بے تکی کی انتہا ہے اور کج فہمی کی معراج ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ سیدنا معاذ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے عین مطابق نماز پڑھائیں، جتنی مقدار میں قراءت آپ کرتے تھے، اتنی ہی مقدار آپ قراءت کریں، پھر بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ڈانٹیں کہ:

أترید أن تكون فتاناً یا معاذ ؟ إذا أممت الناس فاقراً ﴿والشَّمْسُ وضحاها﴾ و ﴿سَبَّحَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ و ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ ﴿وَاللَّيْلُ إذا یغشی﴾ .

”اے معاذ! کیا تو دین سے متنفر کرنے والا بننا پسند کرتا ہے؟ جب تو لوگوں کی امامت کرے، تو (سورۃ بقرہ نہیں

بلکہ) سورۃ الشمس، سورۃ الاعلیٰ، سورۃ القلم اور سورۃ اللیل پڑھا کر۔“ (صحیح مسلم: ۴۶۵)

کیا خود آپ قراءت لمبی کر کے نماز پڑھاتے تھے اور معاذ کے اسی فعل کو فتنہ قرار دیتے تھے؟ یا للعجب دلضیعہ (الحدیث)۔
 ویسے بھی صحیح مسلم میں سیدنا معاذ کا عشاء الآخرة پڑھ کر اپنی قوم کو یہی نماز پڑھانا مذکور ہے، لہذا یہ تاویل باطل ہوئی۔
 حافظ نووی حدیث معاذ رضی اللہ عنہ میں احناف کی تاویلات ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وکل هذه التأویلات دعوى لا أصل لها فلا يترك ظاهر الحديث بها .

”یہ تمام تاویلات بے دلیل دعوے ہیں، ان کی بنا پر حدیث کے ظاہری مفہوم کو چھوڑنا نہیں جاسکتا۔“

(شرح مسلم از نووی: ۱۸۷/۱)

بفضل اللہ ہم نے حدیث معاذ پر آج تک وارد ہونے والے تمام اعتراضات و تاویلات کے جوابات دے دیے ہیں، اگر اب بھی کسی شخص کے ذہن میں کوئی اشکال یا تاویل ہو تو وہ اسے اپنے تئیں محدود نہ رکھے، بلکہ ہمیں ضرور مطلع کرے تاکہ اس کا بھی منصفانہ تجزیہ کیا جاسکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں احادیث صحیحہ کے بے تکیہ جوابات دینے اور فضول تاویلات سوچتے رہنے کی بجائے ان پر عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری زندگی دفاع حدیث کے لیے خاص کر دے اور اس عمل کو ہماری نجات کا ذریعہ بنا دے۔

(آمین!)



حافظ ابو یحییٰ نور پوری

اجماع معصوم دلیل ہے:

حافظ ابن الجوزی مشہور حنفی علی بن محمد الدامغانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اس نے امام ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد بن حسن شیبانی کے علاوہ کسی کی رائے کو فیصلہ کن ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اپنی مجلس میں با آواز بلند یہ اعلان کر دیا ہے کہ اب دنیا میں کوئی مجتہد باقی نہیں رہا، اسے معلوم نہیں کہ اس کی اس بات میں کیا خرابی مضمر ہے، یعنی اجماع جو کہ شریعت کی ٹھوس ترین دلیل ہے، وہ اس سے انکاری ہو گیا ہے، حالانکہ ہمارے پاس اجماع کے سوا کوئی معصوم دلیل موجود نہیں، اللہ تعالیٰ نے اسے امت محمدیہ میں نبوت کا بدل قرار دیا ہے، کیونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے، آپ کے بعد تو کوئی نبی آنے سے رہا، لہذا اللہ نے اس امت کے اجماع کو اس کا قائم مقام کر دیا ہے۔“ (المنتظم لابن الجوزی: ۲۱۰/۹، ۵۱۳ھ)

تبرکات کی شرعی حیثیت:

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

یہ نہایت اہم مسئلہ ہے، کیونکہ بسا اوقات اس کی وجہ سے توحید کے منافی اقوال و افعال سرزد ہو جاتے ہیں، اولیاء و صلحاء کی عبادت کا بنیادی سبب ان کی ذات، آثار اور قبور کو تبرک سمجھنا تھا، شروع میں انہوں نے ان کے جسموں کو تبرک کی نیت سے چھوا، پھر ان کو پکارنے لگے، ان سے مدد مانگنے لگے، پھر ان اولیاء سے کام آگے بڑھا تو مختلف جگہیں، جمادات اور اوقات کو تبرک سمجھنے جانے لگے۔

در اصل تبرک کا معنی یہ ہے کہ اجرو ثواب اور دین و دنیا میں اضافے کے لیے کسی مبارک ذات یا وقت سے برکت حاصل کرنا۔

محققین علماء کے نزدیک تبرک کی دو قسمیں ہیں:

۱..... مشروع تبرک: جسے اللہ و رسول کے جائز قرار دیا ہو۔

۲..... ممنوع تبرک: جو جائز تبرک میں شامل نہ ہو یا شارع نے اس سے منع فرما دیا ہو۔

ممنوع تبرک

ممنوع تبرک شرک میں داخل ہے، اس کی دلیل یہ ہے:

سیدنا ابوداؤد اللیثی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین کی طرف نکلے، اس وقت ہم نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، ایک بیری تھی، جس کے پاس مشرکین ٹھہرتے اور (تبرک کی غرض سے) اپنا اسلحہ اس کے ساتھ لٹکاتے، اسے ذات انواط کہا جاتا تھا، ہم نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! جس طرح مشرکین کا ذات انواط ہے، ہمارے لیے بھی کوئی ذات انواط مقرر کر دیجیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ اکبر، انہا السنن، قلت، والذی نفسی ببیدہ، کما قالت بنو اسرائیل لموسیٰ: ﴿اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمُ الْهَتَّةُ﴾ (الاعراف: ۱۳۸) لتو کین سنن من کان قبلکم۔

”اللہ اکبر! اللہ کی قسم، یہ پرانا طریقہ ہے، تم نے اسی طرح کہا ہے، جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمُ الْهَتَّةُ﴾ (الاعراف: ۱۳۸) (ہمارے لیے بھی کوئی معبود بنا دیجیے، جس طرح ان کافروں کے معبود ہیں) ضرور تم اپنے سے پہلے لوگوں کے نقش قدم پر چلو گے۔“

(مسند الامام احمد: ۲/۵: ۲۷۸، جامع الترمذی: ۲۸۰، مسند الحمیدی: ۸۴۸، المعجم الکبیر للطبرانی: ۲/۳: ۲۷۷، صحیح)

امام ترمذی نے اس حدیث کو ”حسن صحیح“ اور امام ابن حبان (۶۷۰۲) نے ”صحیح“ کہا ہے۔

مشروع تبرک

آئیے اب مشروع تبرک کے بارے میں جانتے ہیں:

عیسیٰ بن طہمان کہتے ہیں:

اخرج الینا انس رضی اللہ عنہ نعلین جردا وین ، لهما قبالاتان ، فحدثنی ثابت البنانی بعد عن انس انهما نعلان النبی صلی اللہ علیہ وسلم .

”سیدنا انس رضی اللہ عنہ ہمارے پاس بغیر بالوں کے چڑے کے دو جوتے لائے، ان کے دو تھے تھے، اس کے بعد مجھے ثابت بنانی نے سیدنا انس کے واسطے سے بتایا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے تھے۔“

(صحیح بخاری : ۴۳۸/۱ : ج ۳۱ : ص ۷)

ایک دفعہ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے ایک سبز جہ نکالا اور فرمایا:

ہذہ کانت عند عائشة حتی قبضت ، فلما قبضت قبضتها ، وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبسها ، فنحن نغسلها للمرضی یمشی یستشفى بها .

”یہ سیدہ عائشہ کے پاس تھا، آپ فوت ہوئیں تو میں نے اپنے پاس رکھ لیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے زیب تن فرمایا کرتے تھے، ہم اسے بیماروں کے لیے شفا کی امید سے پانی میں ڈالتے ہیں۔“ (صحیح مسلم : ۱۹۰/۲ : ج ۲ : ص ۶۹)

سیدنا سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ نے ایک پیالہ اپنے پاس رکھا ہوا تھا، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے پانی پیا تھا، ابو حازم کہتے ہیں کہ سہیل نے اسے نکالا اور ہم نے اس میں پانی پیا، اس کے بعد امام عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان سے مانگا، انہوں نے ان کو تحفہ میں دے دیا۔ (صحیح بخاری : ۸۴۲/۲ : ج ۱۰ : ص ۵۶۳)

عبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں، ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک تھے، جنہیں ہم نے سیدنا انس یا ان کے گھر والوں سے لیا تھا، کہتے ہیں، اگر میرے پاس آپ کا ایک بال ہو تو مجھے دنیا و ما فیہا سے زیادہ پیا رہے۔

(صحیح بخاری : ۲۹/۱ : ج ۱۷۰)

یاد رہے کہ یہ تبرک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا، اب کسی اور کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

حافظ شاطبی فرماتے ہیں:

ان الصحابة بعد موتہ لم یقع من أحد منهم شیء من ذلك بالنسبة الی من خلفه ، اذ لم یتبرک النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعده فی الأمة أفضل من أبی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ ، فهو کان خلیفته ، ولم یفعل به شیء من ذلك ، ولا عمر رضی اللہ عنہ ، وهو کان أفضل الأمة بعده ، ثم كذلك عثمان ، ثم علی ، ثم سائر الصحابة الذین لا أحد أفضل منهم فی الأمة ، ثم لم یثبت لو أحد منهم من طریق صحیح معروف أنّ متبرکاً تبرک به علی أحد تلك الوجوه أو نحوها ، بل اقتصروا فیهم علی الاقتداء بالأفعال والأقوال والسير التي اتبعوا فیها النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، فهو اذا اجتمع منهم علی ترک تلك الأشياء .

”صحابہ کرام نے آپ کی وفات کے بعد آپ کے علاوہ کسی کے لیے یہ (تبرک) مقرر نہ کیا، کیونکہ آپ کے بعد

امت میں سب سے افضل سیدنا ابوبکر صدیق تھے، آپ کے بعد خلیفہ بھی تھے، ان کے ساتھ اس طرح کا کوئی معاملہ نہیں کیا گیا، نہ سیدنا عمر نے ہی ایسا کیا، وہ سیدنا ابوبکر کے بعد امت میں سب سے افضل تھے، پھر اسی طرح سیدنا عثمان و علی رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ کرام تھے، کسی سے بھی باسنجد صحیح ثابت نہیں کہ کسی نے ان کے بارے میں اس طرح سے کوئی تبرک والا سلسلہ جاری کیا ہو، بلکہ ان (صحابہ) کے بارے میں انہوں (دیگر صحابہ و تابعین) نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر مبنی اقوال و افعال اور طریقہ کار پر اکتفا کیا ہے، لہذا یہ ان کی طرف سے ترک تبرکات پر اجماع ہے۔“

(الاعتصام: ۲/۹-۸)

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تشد الرحل الا الى ثلاثة مساجد ، المسجد الحرام ، و مسجدی هذا ، و المسجد الأقصى .

”(تبرک کی نیت سے) سامان صرف ان تین مسجدوں کی طرف باندھا جائے گا، مسجد حرام، میری مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ۔“

(صحیح بخاری: ۱۵۹۱/ع: ۱۱۸۹/صحیح مسلم: ۴۲۴۷/ع: ۱۳۹۷)

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ان تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور جگہ کی طرف سامان باندھ کر جانے کی نذر

مان لے تو اس پر نذر کا پورا کرنا ضروری نہ ہوگا، اس بات پر ائمہ دین کا اتفاق ہے۔ (مجموع الفتاویٰ: ۲۷/۱۸ مختصراً)

حصول برکت کی خاطر انبیاء و صلحاء کی قبروں کی زیارت کے لیے سفر بدعت ہے، صحابہ کرام و تابعین عظام نے ایسا نہیں کیا، نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا۔

امام ابراہیم نخعی تابعی فرماتے ہیں:

لا تشد الرحال الا الى ثلاثة مساجد ؛ المسجد الحرام ، مسجد الرسول ، و بیت المقدس .

”(برکت حاصل کرنے کی نیت سے) رخت سفر صرف تین مسجدوں کی طرف باندھا جائے گا، مسجد حرام، مسجد

نبوی اور بیت المقدس۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۶۵/۴ و سندہ صحیح)



الوسعید

معوذتین

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أقرأ بالمعوذات دبر كل صلاة .

”رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھنے کا حکم دیا۔“

(عمل اليوم والليلة لابن السني: ۱۲۲/۱ و سندہ صحیح واخرجه احمد: ۱۵۵/۴ و سندہ

صحیح واخرجه ابو داؤد (۱۵۲۳) و النسائي (۱۳۲۷) و احمد (۲۰۱/۴) و سندہ حسن صححه ابن خزيمة (۷۵۵) و ابن

هبان (۲۳۴۷-الموارد ابو قال الزهبي: هذا حسن غريب) ميزان الاعتدال: ۴/۴۳۲))

قارئین کے سوالات

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

روزوں کی قضائی

سوال: کیا رمضان میں کسی عذر کی بنا پر چھوڑے گئے روزوں کی قضائی رمضان کے فوراً بعد دینا ضروری ہے؟

جواب: رمضان کے چھوڑے گئے روزوں کی قضائی پے در پے مستحب تو ہے، ضروری نہیں، کیونکہ:

۱..... فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ (البقرة: ۱۸۵) ”دوسرے دنوں کی گنتی ہے۔“

۲..... سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: کان یکون علی الصوم من رمضان فما أستطيع أن أقضيه إلا في شعبان. ”مجھ پر رمضان کے روزوں کی قضائی ہوتی، میں انہیں شعبان سے پہلے نہ رکھ سکتی تھی۔“

(صحیح بخاری: ۱۹۵۰، صحیح مسلم: ۱۱۴۶)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ”اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رمضان کی قضاء کو مطلق طور پر مؤخر کرنا جائز ہے، خواہ

عذر کی وجہ سے یا بغیر عذر کے۔“ (فتح الباری: ۱۹۷/۴)

۳..... سیدنا عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: لا يضرك كيف قضيتها، إنما هي عدة من أيام آخر

”جتنے کوئی نقصان نہیں، جیسے جی چاہے قضائی دے، صرف دوسرے دنوں کی گنتی (پوری کرنا ضروری) ہے۔“

(تفلیح التعلیل لابن حجر: ۱۸۶/۳، وسندہ صحیح)

۴..... امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، دونوں نے

فرمایا: فرقه إذا أحصيته - ”جب نو گنتی رکھے، تو وقفے میں کوئی حرج نہیں۔“ (سنن دارقطنی: ۱۹۳/۴، وسندہ حسن)

۵..... سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یواترہ إن شاء

”چاہے، تو پے در پے رکھ لے۔“ (مصنف ابن ابی نبیہ: ۳۴/۳، وسندہ صحیح)

۶..... بکر بن عبداللہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

أنه كان لا يرى به بأسا، ويقول: إنما قال الله ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾

”آپ رضی اللہ عنہ وقفے یا تاخیر میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ اللہ تعالیٰ نے صرف دوسرے

دنوں کی گنتی کا ذکر فرمایا ہے۔“ (السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۵۸/۴، وسندہ صحیح)

۷..... ابو عامر الہوزنی کہتے ہیں:

سمعت أبا عبيدة بن الجراح رضي الله عنه سئل عن قضاء رمضان فقال: إن الله لم يرخص

لكم في فطره وهو يريد أن يشق عليكم في قضائه، فأحص العدة واصنع ماشئت.

”میں نے سیدنا ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو سنا، آپ سے رمضان کی قضاء کے بارے پوچھا گیا، آپ نے

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے روزہ چھوڑنے کی رخصت اس لیے نہیں دی کہ قضاء میں تم پر مشقت ڈال دے، آپ گنتی شمار کریں اور

جو چاہیں کریں۔“ (السنن الكبرى للبيهقي: ۲۵۸/۴، سنن دار قطنی: ۱۹۱/۲، وسندہ حسن)

۸..... سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فرق قضاء رمضان، وأحص العدة.

”رمضان کی قضاء کو وقفے سے پورا کرلو، لیکن گنتی شمار کرو۔“ (سنن دار قطنی: ۱۹۲/۲، وسندہ حسن)

۹..... امام حکم بن عتیہ رحمہ اللہ وقفے سے قضاء رمضان میں کوئی حرج خیال نہیں کرتے تھے۔

(ابن ابی شیبہ: ۳۳/۲، وسندہ صحیح)

۱۰..... جعفر بن میمون کہتے ہیں:

قضاء رمضان عدة من أيام آخر. ”قضاء رمضان میں صرف دوسرے دنوں کی گنتی (پوری کرنا) ضروری

ہے۔“ (ابن ابی شیبہ: ۳۳/۲، وسندہ صحیح)

فوری قضائی کے قائلین کے دلائل

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قضاء رمضان کے بارے میں فرماتے ہیں:

یتابع بينه. ”اس میں پے درپے روزہ رکھا جائے گا۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۴/۲، وسندہ صحیح)

عروہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یواتر قضاء رمضان. ”رمضان کے روزوں کی قضاء لگا تار دے گا۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۴/۲، وسندہ صحیح)

سعید بن مسیب فرماتے ہیں: یقضیه کھیأته.

”جس طرح چھوڑے تھے، اسی طرح قضائی دے گا۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۴/۲، وسندہ صحیح)

محمد بن سیرین کہتے ہیں: أحب إلّی أن یصومه کما أفطره.

”مجھے محبوب یہی ہے کہ جس طرح روزے چھوڑے تھے، اسی طرح قضائی دے۔“ (ابن ابی شیبہ: ۳۴/۲، وسندہ صحیح)

حکم بن عتیہ کہتے ہیں: ”لگا تار قضائی دینا مجھے پسند ہے۔“ (ابن ابی شیبہ: ۳۴/۲، وسندہ صحیح)

قاسم بن محمد کہتے ہیں: صمه متتابعاً، إلا أن یقطع بک کما قطع بک فیہ.

”لگا تار روزے رکھ، الا یہ کہ (قضائی میں بھی) وہی عارضہ پیش آجائے، جو پہلے پیش آیا تھا۔“

(ابن ابی شیبہ: ۳۴/۲، وسندہ صحیح)

ان سب اقوال کو انتخاب پر محمول کیا جائے گا، جیسا کہ امام عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں:

یقضیه متتابعاً أحب إلّی وإن فرق أجزأه.

”رمضان کی قضائی لگا تار ہو، تو مجھے محبوب ہے، اگر وقفہ آجائے، تو کفایت کر جائے گی۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۵/۲، وسندہ صحیح)

روزوں کی قضائی پے درپے مستحب ہے، ضروری نہیں، جو لوگ لگا تار قضائی کو ضروری قرار دیتے ہیں، ان کے پاس

نذوقی دلیل ہے، نہ سلف صالحین میں سے ان کا کوئی حامی ہے۔

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

کیا قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

اگر کوئی نماز میں ہنس پڑے تو نماز ہی ٹوٹے گی، وضو نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ:

دلیل نمبر ۱: حافظ ابن المنذر (م: ۳۱۸ھ) لکھتے ہیں:

أجمع أهل العلم على أن الضحك في غير الصلاة لا ينقض الطهارة ولا يوجب وضوءاً وأجمعوا على أن الضحك في الصلاة ينقض الصلاة.

”اس بات پر اہل علم کا اجماع و اتفاق ہے کہ نماز کے علاوہ ہنسا وضو کو نہیں توڑتا، نہ ہی وضو کو واجب کرتا ہے، اس بات پر بھی اجماع ہے کہ نماز میں ہنسا نماز کو توڑ دیتا ہے۔“ (الوسط لابن المنذر: ۲۳۶/۱)

دلیل نمبر ۲: عن عطاء عن جابر قال: كان لا يرى على الذي يضحك في الصلاة وضوءاً.

”عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں کہ (صحابی رسول) سیدنا جابر (بن عبد اللہ الانصاری) رضی اللہ عنہ نماز میں ہنسنے والے پر وضو خیال نہیں کرتے تھے۔“ (سنن الدارقطنی: ۱۷۴/۸ ج: ۶۵۰، وسندہ حسن)

دلیل نمبر ۳:

”ہشام کہتے ہیں کہ میرے بھائی نماز میں ہنس پڑے، ان کو عروہ نے نماز دہرانے کا کہا، وضو کرنے کا نہیں کہا۔“

(مصنف ابن ابی نبیہ: ۳۸۷/۱، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ۴: عن عطاء في الرجل يضحك في الصلاة، قال: ان تبسم فلا ينصرف، وان قهقهه استقبل الصلاة، وليس عليه وضوء.

”امام عطاء بن ابی رباح نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا، جو نماز میں ہنس پڑے، اگر اس نے تبسم ظاہر کیا، تو نماز نہیں توڑے گا، لیکن اگر قہقہہ لگا کر ہنسا تو نماز دہرانے کا، البتہ اس پر وضو نہیں ہے۔“

(مصنف ابن ابی نبیہ: ۳۸۷/۱، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ۵: عبد الرحمن بن قاسم کہتے ہیں: ضحكت وأنا أصلي مع أبي، فأمرني أن أعيد الصلاة

”میں اپنے والد صاحب کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ہنس پڑا، انہوں نے مجھے نماز دہرانے کا حکم دیا۔“

(مصنف ابن ابی نبیہ: ۳۸۷/۱، وسندہ صحیح)

دلیل نمبر ۶: محمد بن سيرين تابعي کہتے ہیں: كانوا يأمرونا ونحن صبيان، اذا ضحكنا في الصلاة أن

نعيد الصلاة. ”بچپن میں جب ہم نماز میں ہنس پڑتے تو (علماء) ہمیں نماز دہرانے کا حکم دیتے تھے۔“

(مصنف ابن ابی نبیہ: ۳۸۸/۱، وسندہ صحیح)

امام احمد بن حنبل (مسند احمد لابن حنبل: ۷/۸)، امام شافعی (الام للشافعی: ۳/۱)، امام اسحاق بن راہویہ

(مسائل اصمد واسماء: ۲۰/۸) کا بھی یہی فتویٰ ہے۔

امام ابو بکر ابن ابی شیبہ فرماتے ہیں: یعید الصلاة ولا یعید الوضوء.

”نماز میں ہنسنے والا نماز تو دہرائے گا، لیکن وضو نہیں دہرائے گا۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۸۸/۸)

تقلید پرست جمہور امت اور سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں کہتے ہیں کہ اگر کوئی نماز میں ہنس پڑے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے، وہ اس کو وضو لوٹانے کا حکم دیتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس اس بارے میں کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔

ہم انتہائی اختصار کے ساتھ ان کے دلائل کا محدثین کرام کے اصولوں کے مطابق جائزہ پیش کرتے ہیں:

دلیل نمبر ۱: سیدنا ابو موسیٰ اشعری نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور مسجد میں واقع ایک کڑھے میں گر گیا، اس کی بصارت میں نقص تھا، بہت سارے لوگ نماز میں ہنس پڑے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص ہنسا ہے، وہ وضو بھی دوبارہ کرے گا اور نماز دہرائے گا۔

(المعجم الكبير للطبرانی: ۴۶۶/۱، نصب الرایۃ: ۴۷/۱)

تبصرہ: اس کی سند ”ضعیف“ ہے، اس میں ہشام بن حسان ”مدلس“ ہیں، جو ”عن“ سے روایت کر رہے ہیں، لہذا مدلس کی صحیح بخاری و مسلم کے علاوہ ”عن“ والی روایت ”ضعیف“ ہوتی ہے۔

دلیل نمبر ۲: ابو العالیہ الریاحی نے کہا کہ ایک اندھا کنویں میں گر گیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو نماز پڑھا رہے تھے، آپ کے ساتھ نماز پڑھنے والے کچھ لوگ ہنس پڑے، تو آپ نے فرمایا، جو ہنسا ہے، وہ وضو بھی دوبارہ کرے اور نماز بھی دہرائے۔“ (مصنف عبد الرزاق: ۳۷۶/۲، ج: ۳۷۶-۳۷۷)

تبصرہ: اس کی سند ”مدلس“ اور ”انقطاع“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔ امام ابن المیزان فرماتے ہیں:

حدیث أبی العالیۃ مرسل، والمرسل لا تقوم به الحجۃ.

”ابو العالیہ کی حدیث مرسل ہے اور مرسل حدیث سے حجت قائم نہیں ہو سکتی۔“ (الادوس: ۲۲۸/۵)

یاد رہے کہ دین متصل، صحیح روایات کا نام ہے۔

دلیل نمبر ۳: حسن بصری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک نابینا آدمی قبلہ کی جانب سے نماز کے ارادہ سے آیا، لوگ فجر کی نماز میں مشغول تھے، یہ نابینا ایک کڑھے میں گر گیا، کچھ لوگ ہنس پڑے، حتیٰ کہ انہوں نے قہقہہ لگا دیا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا، جس نے قہقہہ لگا دیا ہے، وہ وضو اور نماز دونوں کو دہرائے۔“ (کتاب التذکرۃ لابیہ محمد: ۲۳)

تبصرہ: یہ موضوع (من گھڑت) حدیث ہے، کیونکہ:

۱..... یہ مرسل ہے اور مرسل روایت ”ضعیف“ ہوتی ہے۔

۲..... راوی کتاب محمد بن حسن الشیبانی ”کذاب“ ہے۔

۳..... اس میں محمد بن حسن الشیبانی کا استاذ بالاتفاق ”ضعیف و متروک“ ہے، کسی ”ثقہ“ امام سے اس کا ”ثقہ“ ہونا باسند ”صحیح“ ثابت نہیں۔

دلیل نمبر ۴: معبد سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے میں مشغول تھے کہ ایک نابینا آدمی نماز کے ارادے سے آیا اور ایک گڑھے میں گر گیا، کچھ لوگ ہنس پڑے، حتیٰ کہ انہوں نے قہقہہ لگا دیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا، جس نے قہقہہ لگا دیا ہے، وہ وضو اور نماز دونوں کو دہرائے۔ (سنن الدارقطنی: ۱۶۶/۱، ج: ۱۲)

تبصرہ: یہ روایت سخت ترین ”ضعیف“ ہے، کیونکہ:

۱..... اس میں ”ارسال“ ہے، معبد الجعفی تابعی ہیں، خود امام دارقطنی نے اس کو ”مرسل“ کہا ہے، جناب زلیعی حنفی نے بھی اس کو ”مرسل“ قرار دیا ہے۔ (نصب الراية: ۵/۸)

۲..... اس میں امام حسن بصری کی تدلیس ہے۔

۳..... اس کی سند کا دارودار النعمان بن ثابت پر ہے، جو بالا جماع ”مجروح“ ہیں۔

دلیل نمبر ۵: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس نے نماز میں قہقہہ لگا دیا، وہ وضو اور نماز دہرائے۔ (المکمل لابن عدی: ۱۶۷/۲)

تبصرہ: یہ روایت بھی ”ضعیف“ ہے، کیونکہ اس میں ”انقطاع“ ہے، امام عطاء بن ابی رباح کا سیدنا ابن عمر سے سماع ثابت نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: قد رأی ابن عمر ولم یسمع منه .

”یقیناً انہوں نے سیدنا ابن عمر کو دیکھا ہے، لیکن ان سے سماع نہیں کیا۔“ (البرasil لابن ابی ہاتم: ۱۵۴)

یہی بات امام علی بن مدینی اور امام ابو عبد اللہ نے بھی فرمائی ہے۔ (عزیز السیسی: ۱۸۲/۷)

نیز اس میں بقیہ بن ولید راوی اگرچہ جمہور کے نزدیک ”ثقہ“ ہیں (دیکھیں: الترغیب والترہیب للمنذری: ۵/۵۶۷) الکائف للذهبی: ۱۶۷-۱۰۷)؛ لیکن ”تدلیس تسویہ“ کے مرتکب تھے، لہذا سند مسلسل بالسماع ہونی چاہیے۔

حافظ ابن حجر ایک دوسری روایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

بقیة صدوق، لكنه يدلس ويسوي، قد عننه عن شيخه وشيخ شيخه .

”بقیہ صدوق راوی ہے، لیکن تدلیس تسویہ کرتا تھا، اس نے اپنے استاذ اور استاذ کے استاذ سے بصیغہ عن روایت کی

ہے۔“ (موافقة الخبر الخبر لابن حجر: ۲۷۸/۱)

حافظ ابن ملقن لکھتے ہیں: لكن بقية رمى بتدليس التسوية، فلا ينفعه تصريحه بالتحديث

”بقیہ پر تدلیس تسویہ کا الزام ہے، لہذا صرف اپنے شیخ سے سماع کی تصریح چنداں مفید نہیں۔“

(البرasil البیہق: ۵۰۹/۴)

اس روایت کے ”ضعیف“ ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے، امام ابن عدی اسے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ومحمد الخزازي هذا هو من مجهولي مشايخ بقية ، ويقال عن بقية في هذه الحديث عن محمد بن راشد عن الحسن ، ومحمد بن راشد أيضا عن الحسن مجهول .

”اس روایت میں موجود محمد الخزازی ، بقیہ کے مجهول اساتذہ میں سے ہے، اس سند میں محمد بن راشد عن الحسن بھی بیان کیا جاتا ہے اور حسن بصری سے بیان کرنے والا محمد بن راشد بھی مجهول ہے۔“ (الکامل: ۱۶۷/۴-۱۶۶/۴)

حافظ ابن حجر (لسان المیزان: ۱۶۲/۵) اور حافظ ذہبی (میزان الاعتدال: ۵۴۴/۴: المغنی: ۲۹۷/۲) نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

جناب ابن ترکمانی حنفی لکھتے ہیں: ابن راشد هذا وثقه ابن حنبل وابن معين.... (المعجم للنقی: ۱۶۷/۱)

ہم کہتے ہیں کہ جناب ابن ترکمانی حنفی صاحب شدید وہم و اختلاط کا شکار ہو گئے ہیں، محمد الخزازی ”مجهول“ کو محمد بن راشد الحکوی سمجھ بیٹھے ہیں، ایک ”ثقة“ راوی کی ”توثیق“ ایک ”مجهول“ پر قہوپ دی ہے، ابن ترکمانی کی تقلید ناسدید میں جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی کا اسے محمد بن راشد الحکوی کہہ کر اس روایت کو ”حسن“ قرار دینا بی جہالت ہے، کیونکہ محمد بن راشد الحکوی کے اساتذہ میں کسی محدث نے بھی حسن بصری کو ذکر نہیں کیا، نہ ہی حسن بصری کے شاگردوں میں ان کا نام موجود ہے، اس لیے حافظ ذہبی نے لکھا ہے:

محمد بن راشد عن الحسن نكرة . ”حسن بصری سے بیان کرنے والا محمد بن راشد مجهول ہے۔“

(المغنی: ۲۹۷/۲: میزان الاعتدال: ۵۴۴/۴)

ثابت ہوا کہ اس روایت میں محمد الخزازی سے مراد محمد بن راشد الحکوی نہیں، بلکہ اور کوئی ہے، جس کے حالات نہیں مل سکے۔ ہماری بات کی تصدیق کے لیے صرف محمد بن راشد الحکوی کا حسن بصری سے سماع نہ ملنا ہی کافی تھا، محدثین کی تصریح مزید سونے پر سہاگہ ہے۔

دلیل نمبر ۶: عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اذ قهقهه أعاد الوضوء والصلاة.“ (جب کوئی (نماز میں) قہقہہ لگائے، وہ وضو اور نماز کا اعادہ کرے۔“

(الکامل لابن عری: ۱۶۷/۴)

تبصرہ: یہ سند ”موضوع“ (من گھڑت) ہے۔ کیونکہ:

۱..... اس میں عمرو بن عبید راوی ”متروک و کذاب“ اور ”داعی الی البدع“ ہے، یونس بن عبید کہتے ہیں:

کان عمرو بن عبید یکذب فی الحدیث . یعنی: ”عمرو بن عبید حدیث میں جھوٹ بولتا تھا۔“

(البرج والتعمیل: ۲۴۷/۶)

ابو حاتم کہتے ہیں کہ ”متروک الحدیث“ ہے۔ (البرج والتعمیل: ۲۴۷/۶)

حمید کہتے ہیں: لا تاخذ عن هذا شيئا ، فانه يكذب على الحسن .

”اس سے کچھ روایت نہ کرو، کیونکہ یہ حسن بصری پر جھوٹ باندھتا ہے۔“ (البرج والتعمیل: ۲۴۷/۶: وسندہ حسن)

عمرو بن علی کہتے ہیں: کان متروک الحدیث، صاحب بدعة . (البرج والتعمیل: ۲۴۷/۶: وسندہ صحیح)

نعیم بن حماد کہتے ہیں کہ میں نے امام عبداللہ بن مبارک سے پوچھا کہ محدثین کرام نے عمرو بن عبید کو کس بتا پر ”متروک“ قرار دیا ہے؟ فرمایا، یہ بدعت کا داعی ہے۔ (الجرع والتعمیل: ۳۴۷/۶، وسندہ حسن)

۲..... اس کا دوسرا راوی عمر بن قیس المکی بھی ”متروک“ ہے۔

۳..... اس میں حسن بصری کی ”تدلیس“ بھی ہے۔

دلیل نمبر ۷: عام شرعی کہتے ہیں: ”یہ فقہ فقہ ہے، ایسا انسان وضو اور نماز کا اعادہ کرے گا۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۸۸/۱)

تبصرہ: اس کی سند ”ضعیف“ ہے، اس میں اشعث بن سوار نامی راوی ”ضعیف“ ہے۔ (تقریب التریب: ۵۲۷)

امام مسلم نے اس سے متابعت میں روایت لی ہے، اس میں ابو خالد الاحمر ”مدرس“ بھی موجود ہے۔

دلیل نمبر ۸: ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ جب آدمی نماز میں ہنس پڑے تو وہ وضو اور نماز دونوں کا اعادہ کرے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۸۸/۱)

تبصرہ: اس میں مغیرہ نامی راوی کا تعین مطلوب ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ ابراہیم نخعی کا قول ہے، نہ قرآن ہے، نہ حدیث ہے، نہ اجماع امت ہے، آل تقلید امام ابراہیم نخعی کے مقلد یا امام ابو حنیفہ کے۔

لہذا یہ کہنا کہ نماز میں ہنسنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، باطل، بلکہ ابطال الابطال ہے، ایک با وضو انسان کا وضو اس وقت ٹوٹے گا، جب سنت یا اجماع سے دلیل قائم ہو جائے گی۔

ہنسنا یا فقہہ لگانا ان چیزوں میں سے نہیں، جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، مثلاً، چھوٹی یا بڑی قضائے حاجت، نیند، ریح وغیرہ، ان چیزوں کے نماز کے اندر واقع ہونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے اور نماز کے باہر بھی، لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نماز کے اندر ہنسنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، ان کے نزدیک نماز کے علاوہ ہنسنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، یہ عجیب منطق ہے!

آل تقلید یہ کہتے ہیں کہ اگر حالت نماز میں ہوا خارج ہوگئی تو وضو ٹوٹ جائے گا، نماز کی دوبارہ وضو کرے، جو نماز پڑھ چکا ہو، اس پر بنیاد کرتے ہوئے باقی ادا کر لے، اگر درمیان میں کلام نہیں کی تو نماز فاسد نہیں ہوگی، اگر کلام کر لی تو نماز فاسد ہو جائے گی، از سر نو نماز ادا کرنا ضروری ہوگا، وہی کہتے ہیں کہ اگر دوران نماز ہنسی آجائے تو وضو اور نماز دونوں کا اعادہ ضروری ہوگا، معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک نماز میں ہنسنا ہوا خارج کرنے سے بھی بڑا کام ہے۔

جناب عبدالشکور لکھنوی فاروقی دیوبندی لکھتے ہیں:

”نابالغ کے قہقہے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اگرچہ نماز میں ہی ہو۔“ (علم الفقہ از لکھنوی: ۹۶)

نیز لکھتے ہیں:

”جنازہ کی نماز اور تلاوت کے سجدہ میں قہقہہ لگانے سے وضو نہیں جاتا، بالغ ہو یا نابالغ۔“ (علم الفقہ: ۹۶)

جبکہ یہ فرق شریعت مطہرہ سے ثابت نہیں، محض ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ دیکھیں کہ یہ لوگ کس طرح اسلام کے

نظامِ نفاذ و طہارت کا سنگین مذاق اڑاتے ہیں!

یاد رہے کہ وضو ایمان میں داخل ہے، یہ بات بھی واضح ہو کہ لکھنوی صاحب نے اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ: ”ہر مسئلہ میں وہی قول لکھا جائے گا، جس پر فتویٰ ہے۔“ (علم الفقہ: ۱۵)

تعب خیز بات تو یہ ہے کہ یہی لوگ کہتے ہیں کہ اگر نماز کے آخر میں سلام پھیرنے سے پہلے اتنی دیر بیٹھا، جتنی دیر میں تشہد پڑھا جاسکتا ہے، پھر جان بوجھ کر ہوا خارج کر دے یا قہقہہ لگا دے یا ہنس دے یا نماز کے منافی کوئی کام کر دے تو نماز مکمل ہوگئی۔ فی اللعجب!

اس سے بڑھ کر حیرانی اس بات پر ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نماز میں ہنسنے سے وضو اور نماز دونوں ٹوٹ جاتے ہیں، ان کے نزدیک اگر نماز میں کسی پر تہمت لگائی یا فحش کلام کر دی تو وضو نہیں ٹوٹے گا، مطلب صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک نماز میں ہنسا کسی پر تہمت لگانے سے بھی بڑا جرم ہے۔

اس پر ایک منظرہ کی روئیداد ملاحظہ فرمائیں:

البویطی یقول : سمعت الشافعی یقول : قال لی الربیع : أنا أشتہی أن أسمع مناظر تک و اللؤلؤی ، قال : فقلت له : لیس هناک ، قال : فقال : أنا أشتہی ذلک ، قال : فقلت : متی شئت ، قال : فأرسل الی حضرنی رجل ممن کان یقول بقولہم ، ثم رجع الی قولی ، فاستتبته وأرسل الی اللؤلؤی ، فجاء ، فأتینا بطعام ، فأکلنا ولم یأکل اللؤلؤی ، فلما غسلنا أیدینا قال له الرجل الذی کان معی : ما تقول فی الرجل قذف محصنة فی الصلاة ؟ قال : بطلت صلاته ، قال : فما حال الطهارة ؟ قال : بحالها ، قال : فقال له : فما تقول فی من ضحک فی الصلاة ؟ قال : بطلت صلاته و طهارته ، قال : فقلت : قذف المحصنات فی الصلاة أیسر من الضحک فی الصلاة ؟ قال : فأخذ اللؤلؤی نعله وقام ، قال : فقلت للفضل : قد قلت لک : انه لیس هناک .

”بویطی کہتے ہیں کہ میں نے امام (محمد بن ادریس) الشافعی کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھے فضل بن ربیع (یہ امیر المؤمنین ہارون الرشید کے دربان تھے) نے کہا، میں آپ کے اور (حسن بن زیاد) اللؤلؤی (کذاب حنفی فقیہ) کے مابین مناظرہ مننا چاہتا ہوں، میں نے کہا، وہ اس قابل نہیں، اس نے کہا کہ میں کرانا چاہتا ہوں، امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے کہا، آپ کب مناظرہ کرانا چاہتے ہیں؟ پھر اس (فضل بن ربیع) نے (مناظرے کے لیے) مجھے بلوایا، اسی اثنا میں ایک آدمی میرے پاس آیا جو پہلے اللؤلؤی کا معتقد تھا، بعد میں اس نے میرا مسلک اختیار کر لیا تھا، میں نے اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا، اس (فضل بن ربیع) نے اللؤلؤی کو بھی بلایا، وہ آگیا، ہمارا کھانا لایا گیا، ہم سب نے کھانا کھایا، لیکن اللؤلؤی نے نہیں کھایا، جب ہم ہاتھ دھو رہے تھے تو میرے ایک ساتھی نے اللؤلؤی سے پوچھا کہ آپ ایسے انسان کے بارے میں کیا کہتے ہیں، جو نماز میں کسی پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے؟ اس نے کہا، اس کی نماز باطل ہے، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے وضو کیا بنے گا؟ اللؤلؤی نے کہا کہ وہ برقرار رہے گا، اس نے اللؤلؤی سے پوچھا کہ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں، جو نماز میں ہنس پڑے؟ اس نے جواب دیا کہ اس کا وضو اور نماز دونوں باطل ہیں، اس نے کہا کہ میں نے اللؤلؤی

سے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک نماز میں پاک دامن عورت پر زنا و بدکاری کی تہمت لگانا، نماز میں ہنسنے کے مقابلے میں چھوٹا جرم ہے (کہ وہاں صرف نماز ٹوٹی اور یہاں وضو اور نماز دونوں)؟ اس پر اللہ لوی نے جو تے پکڑے اور بھاگ گیا، امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے فضل بن ربیع کو کہا کہ میں نے تو آپ کو پہلے بتایا تھا کہ یہ مناظرہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔“ (الکامل لابن عدی: ۳۱۹/۲ وسندہ حسن)

اس مناظرہ کے راوی ابو جعفر محمد بن زاہر النسائی کے بارے میں امام ابو حاتم الرازی فرماتے ہیں:

لم یکن بہ بأس. (الجرع والتعذیل: ۲۶۰/۷)

قارئین! اب آپ خود فیصلہ کریں کہ دین و ایمان کے خلاف ایسے مضحکہ خیز اور سنسنی خیز مسائل بیان کرنے والے دین کے خیر خواہ ہو سکتے ہیں؟ شریعت کی اس مخالفت کو آپ کیا نام دیں گے؟



ابو عبد اللہ

نامیدی:

نامیدی جائز نہیں، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں دو طریقے سے سوچنے ہے:

۱..... نامید آدمی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کام نہیں کر سکتا، حالانکہ وہ ہر چیز پر ہر وقت قادر ہے۔

۲..... وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو ناقص سمجھتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ رحیم ہے، کسی بندے پر کسی بھی وقت رحم کر سکتا ہے، اس کی رحمت سے نامید آدمی گمراہ ہوتا ہے، چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَقْنَطْ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ﴾ (المعمر: ۵۶)

”اپنے رب کی رحمت سے صرف گمراہ لوگ ہی ناامید ہوتے ہیں۔“

لہذا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر دل میں رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت کی امید بھی رکھی جائے۔

نامیدی کے دو اسباب ہیں:

۱..... یہ کہ آدمی اپنی جان پر ظلم اور گناہوں پر جسارت کرتا رہے، ان پر مصر اور قائم رہنے کا عزم کر لے، پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ختم کر لے، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نے رحمت کے اسباب ختم کر دیئے ہیں، آخر کار یہ ناامیدی اس کی عادت بن جاتی ہے اور شیطان انسان سے زیادہ سے زیادہ یہی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۲..... یہ کہ انسان اپنے کیے ہوئے جرائم کی وجہ سے اتنا ڈراپنے اوپر سوار کر لے کہ لاعلمی میں یہ سمجھ بیٹھے کہ اب اللہ تعالیٰ اسے معاف ہی نہیں کرے گا، اگرچہ وہ سچی توبہ ہی کر لے، یوں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ گناہوں پر مصر نہ رہے، بلکہ ان کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حضور سچی اور سچی توبہ کر لے، پھر یہ عقیدہ رکھے کہ توبہ کے سبب بڑے سے بڑے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں، یہی ناامیدی کا خاتمہ ہے۔

اُؤ عمل کریں !

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

عمل نمبر ۱: سفر سے واپسی پر گھر جانے سے پہلے مسجد میں دو رکعتیں

انسان زندگی کے اس سفر میں کئی سفر کرتا ہے، اس حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی یہ ہے کہ سفر سے واپسی پر مسجد میں جا کر دو رکعتیں نماز ادا کرنے کے بعد گھر کا رخ کرے، یہ سنت مجبورہ ہے، کتنے لوگ اس سے غافل ہیں، اس پیاری سنت کو زندہ کرنے کی اشد ضرورت ہے، جیسا کہ:

(۱)..... سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا قدم من سفر بدأ بالمسجد فصلى فيه))
 ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے واپس تشریف لاتے، تو ابتداً مسجد کے ساتھ کرتے، (یعنی سب سے پہلے مسجد جاتے) اس میں (دو رکعت) نماز ادا کرتے۔“ (صحیح بخاری: ۳۰۸۸، صحیح مسلم: ۷۱۶)
 ایک روایت میں ہے:

((ثُمَّ جَلَسَ فِيهِ))

”پھر اس میں بیٹھتے۔“ (مسلم: ۷۱۶)

حافظ نووی (۶۳۱-۶۷۲ھ) ایک حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

في هذه الأحاديث استحباب الركعتين للقادم من سفره في المسجد أول قدمه وهذه الصلوة مقصودة للقدوم من السفر، تحية المسجد، والأحاديث المذكورة صريحة.
 ”ان احادیث میں سفر سے واپس لوٹنے والے کے لیے سب سے پہلے مسجد میں دو رکعتیں ادا کرنے کے استحباب کا ثبوت ہے، یہ سفر سے لوٹنے والے کی نماز ہے، نہ کہ تحیۃ المسجد، احادیث مذکورہ اس پر صریح دلیل ہیں۔“
 (شرح مسلم للنووی: ۲۴۸۸)

امیر المؤمنین فی الحدیث فقیہ الامت امام بخاریؒ نے اس حدیث پر ”باب الصلوة اذا قدم من سفر“ قائم کیا ہے۔

(۲)..... سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((اشترى مني رسول الله صلى الله عليه وسلم بعيرا، فلما قدم المدينة امرني أن آتي المسجد فأصلي ركعتين))

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے اونٹ خریدا، جب آپ مدینہ تشریف لائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مسجد میں آنے کا حکم دیا کہ میں اس میں دو رکعتیں ادا کروں۔“ (صحیح بخاری: ۴۴۳، صحیح مسلم: ۷۱۵ واللفظ لہ)

(۳)..... سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

((ان رسول الله صلى الله عليه وسلم حين أقبل من حجته، دخل المدينة، فأناخ على باب مسجده، ثم دخله، فركع فيه ركعتين، ثم انصرف الى بيته .

”رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حج سے واپس ہوئے تو آپ نے مدینہ میں داخل ہو کر اپنی مسجد کے دروازے پر سواری کو بٹھا دیا، پھر مسجد میں داخل ہو کر دو رکعتیں ادا کیں، پھر اپنے گھر کی طرف لوٹ گئے۔“
ابن عمر رضی اللہ عنہ کے شاگرد ”نافع“ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا ابن عمر کا بھی یہی طریق کار تھا۔

(مسند الامام احمد: ۱۲۹/۲ سنن ابی داؤد: ۲۷۸۲ - سندہ صحیح)

فائدہ:

۱..... ابو صالح کہتے ہیں:

((اَنَّ عِثْمَانَ كَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ، صَلَّى رَكَعَتَيْنِ))

”سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ جب سفر سے آتے تو دو رکعتیں ادا فرماتے“ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۸۲/۴)

وسندہ حسن ان صحّ سماع أبي صالح عن عثمان ، وهو نفسه صدوق حسن الحديث ، قال الذهبي فيه: ثقة (ميزان الاعتدال: ۵۳۹/۴)

۲..... ایک دوسری روایت میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سفر سے واپسی پر مسجد میں بھی دو رکعتیں پڑھنا ثابت ہے۔

(فضل الصلاة على النبي للامام اساعيل بن اسماه القاضي: ۹۹ - سندہ صحیح)

☆.....☆.....☆

عمل نمبر ۲ گھر سے نکلتے اور داخل ہونے وقت کی نماز

(۱)..... سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إذا دخلت منزلك فصل ركعتين تمنعانك مدخل السوء، وإذا خرجت من منزلك فصل ركعتين تمنعانك مخرج السوء.

”جب تم اپنے گھر میں داخل ہو تو دو رکعتیں ادا کرو، وہ تمہیں اندرونی برائی سے محفوظ رکھیں گی، اسی طرح جب تم گھر سے نکلو تو دو رکعتیں ادا کرو، وہ تمہیں بیرونی نقصان سے بچائیں گی۔“ (کشف الاستار: ۷۴۶ - سندہ صحیح)

حافظ ثمالی کہتے ہیں: رجاله موثقون۔ (مجمع الزوائد: ۲۸۳/۲ - ۲۸۴)

۲..... موسیٰ بن ابی موسیٰ اشعری رحمہ اللہ کہتے ہیں:

((اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ فَصَلَّى فِي بَيْتِهِ رَكَعَتَيْنِ عَلَى طَنْفَسَةٍ))

”سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ایک سفر سے واپس آئے تو اپنے گھر میں چٹائی پر دو رکعتیں ادا کیں۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۸۲/۴ - سندہ حسن)

عمل نمبر ۳:

شہر بن خوشب کہتے ہیں کہ میں نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ وہ کہہ رہی تھیں کہ سیدہ فاطمہ

رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، آپ سے کام کی شکایت کی، کہنے لگیں، اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم، چکی پینے کی وجہ سے میرے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے ہیں، آٹا پیستے ہوں، پھر گوندھتی ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا، اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے مقدر میں کچھ لکھا ہے، وہ آپ کو ضرور ملے گا، میں آپ کو اس سے بہتر چیز کی راہنمائی کرتا ہوں کہ جب آپ سونے کے لیے بستر پر لیٹیں تو ۳۳ مرتبہ ”سبحان اللہ“، ۳۳ بار ”اللہ اکبر“، اور ۳۴ بار ”الحمد للہ“ کہو، یہ پورا سو ہے، جو کہ خادم سے کہیں زیادہ بہتر ہے، نماز فجر اور نماز مغرب کے بعد دس مرتبہ یہ ذکر کریں:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِي وَيُمِيتُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.

”اللہ کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، وہ (ذات و صفات میں) اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی بادشاہت ہے، تعریف و ثناء بھی اسی کی ہے، وہی زندہ کرتا ہے، وہی مارتا ہے، اسی کے ہاتھ میں خیر و بھلائی ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

ہر ایک کے بدلے میں دس نیکیاں لکھ دی جائیں گی، دس گناہ مٹا دیے جائیں گے، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک گردن آزاد کرنے کا اجر و ثواب ملے گا، شرک کے علاوہ کوئی گناہ گرفت نہیں کر سکے گا

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ. یہ آپ کے لیے صبح سے شام تک ہر شیطان اور ہر برائی سے بچاؤ کا ہتھیار ہے۔ (مسند الامام احمد: ۶/۲۹۸، المعجم الكبير للطبرانی: ۲۳/۳۲۹، وسند حسن)

حافظ ذہبی فرماتے ہیں: اسنادہما حسن.

”(احمد اور طبرانی) دونوں کی سند حسن ہے۔“ (مجمع الزوائد: ۱۰/۱۸۸۰)

اس حدیث کے راوی شہر بن حوشب کو امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام ابو زرعہ، امام علی، امام بخاری، امام ابو حاتم الرازی، امام یعقوب بن شیبہ، امام یعقوب بن سفیان الفسوی اور جمہور نے توثیق کی ہے، نیز خطیب بغدادی (موضع الاوهام بين الجمع والتفسيو: ۸/۳۶) اور محدث المؤمل بن احمد (فوائد المؤمل: ۶) نے اس کی حدیث کی سند کی تحسین کر کے توثیق کی ہے۔ یہ حسن الحدیث ہے۔ حافظ ذہبی نے اس کے ترجمہ کے شروع میں [صح] لکھا ہے، اس کا مطلب ہے کہ ذہبی کے نزدیک اس پر جرح مردود ہے اور توثیق رائج ہے، جیسا کہ حافظ ابن الملقن اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: [صح] واصطلاحه أن العمل على توثيقه.

”[صح] ذہبی کی اصطلاح ہے کہ اس راوی کی توثیق ہی رائج ہے۔“

(البدیع البشير لابن الملقن: ۸/۶۸، لسان الميزان لابن حجر: ۲/۵۹۲ ترجمہ حارث بن محمد بن ابی اسامہ)

اس بارے میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں: الرجل غير مدفوع عن صدق وعلم والاحتجاج به مترجح.

”اس راوی کا صدق و علم ثابت ہے، اس کی حدیث سے حجت پکڑنا ہی رائج ہے۔“ (سير أعلام النبلاء: ۴/۳۷۸)

حافظ ذہبی اس راوی کے بارے میں کہتے ہیں: وحديثه حسن. ”اس کی حدیث حسن ہوتی ہے“

(مجمع الزوائد : ۱۰/۸۰)

نیز کہتے ہیں: والصحيح أنهما فقتان ولا يقدح الكلام فيهما.
”صحیح بات یہ ہے کہ (عبدالحمید بن بہرام اور شہر بن حوشب) دونوں ثقہ ہیں، ان میں جرحی کلام قابلِ قدر نہیں۔“

(مجمع الزوائد : ۲۲۲/۸)



عمل نمبر ۷:

صحابی رسول مسلم بن حارث التیمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سرگوشی کرتے ہوئے فرمایا کہ جب آپ نمازِ مغرب سے فارغ ہوں تو سات مرتبہ یہ دعا پڑھیں:

اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِي مِنَ النَّارِ.

”اے اللہ! مجھے جہنم سے پناہ دے۔“

اگر آپ نے یہ دعا پڑھ لی اور اسی رات فوت ہو گئے تو جہنم سے پناہ لکھ دی جائے گی، جب آپ نمازِ فجر پڑھ لیں تو یہی دعا پڑھ لیں، اگر اس دن فوت ہو گئے تو جہنم سے پناہ لکھ لی جائے گی۔“ (سنن ابی داؤد : ۵۰۷۹ وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان (۲۳۳۶-الموارد) نے ”صحیح“ کہا ہے۔

حافظ ابن حجر نے اس کو ”حسن“ کہا ہے۔ (نتائج الافکار : ۲۳۶/۴)

اس کے راوی حارث بن مسلم کو امام دارقطنی نے ”مجهول“ کہا ہے، جبکہ امام ابن حبان اور حافظ بیہقی اس کو ”ثقہ“ کہتے ہیں۔ (مجمع الزوائد : ۹۹/۸)

اس پر جرح مفسر نہیں ہے، اس کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، لہذا یہ ”حسن الحدیث“ ہے، حافظ ابن حجر ایک اصول بیان کرتے ہیں:

وأما حالها فقد ذكرت في الصحابة ، وان لم يكن يثبت لها صحبة ، فمثلها لا يسأل عن

حالها.

”جہاں تک (رباح کی دادی) کی عدالت کا تعلق ہے تو اس کو صحابہ میں ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ اس کا صحابیہ ہونا

ثابت نہ بھی ہوگا، تب بھی اس کی کسی راویہ کی عدالت کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔“ (التلخیص العبیر : ۷۴/۱)

اس اصول کے مطابق حارث بن مسلم کی عدالت ثابت ہوتی ہے، لہذا یہ ”حسن الحدیث“ ہے۔



منکرین حدیث درحقیقت منکرین قرآن ہیں، ان کے عدم فہم و علم کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

يَقْرُؤُونَ الْقُرْآنَ ، لَا يَجَاوِزُ حُلُوقَهُمْ وَ حَنَاجِرَهُمْ ، يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّينِ مَرْوَقَ السَّهْمِ مِنَ الرِّمِيَةِ .
”وہ قرآن پڑھیں گے، لیکن وہ ان کے حلقوں سے تجاوز نہیں کرے گا، وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے، جس طرح تیرشکار سے نکل جاتا ہے۔“ (صحیح بخاری: ۶۹۳۱)

یہ حدیث خوارج (منکرین حدیث وغیرہ) کے عدم فہم و علم پر بین ثبوت ہے، کیونکہ وہ قرآن وحدیث کی توہین اور مسلمانوں کی تکفیر کے مرتکب ہیں۔
حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

ورد الروايات الصحيحة والطعن في أئمة الحديث الضابطين مع إمكان توجيه ما روي من الأمور التي أقدم عليها كثير من غير أهل الحديث ، وهو يقتضي قصور فهم من فعل ذلك منهم ، ومن ثم قال الكرمانى : لا حاجة لتخطئة الرواة النقاة .

”بہت سے غیر اہل حدیثوں نے احادیث صحیحہ اور روایات ثابتہ کا ردواںکار کیا ہے، حفاظ ائمہ حدیث پر طعن زنی کی ہے، یہ اقدام ان کے ناقص العقل وقاصر الفہم ہونے پر دلیل ہے، اسی وجہ سے کرمانی (شارح بخاری) نے کہا ہے کہ لائقہ راویوں کی طرف خواہ مخواہ غلطی کی نسبت کرنے کی ضرورت نہیں (بلکہ ان کی روایتوں میں جمع وتوفیق اور تطبیق دینا ضروری ہے)۔“ (فتح الباری: ۴/۷۱۳)

منکرین حدیث نے قرآن وحدیث کے اتباع کی بجائے عقل سوء اور نفسانی خواہشات کی پرستش شروع کر دی ہے، ان کے زعم باطل کے مطابق حدیث دلیل شرعی نہیں ہے، وہ حدیث کو قرآن کی ضد خیال کرتے ہیں، جبکہ جہاں قرآن وحی ہے، وہاں حدیث بھی وحی ہے، وحی حق ہے، کیا حق کے ساتھ ٹکرا سکتا ہے؟ ایک حق کو دوسرے حق پر پیش کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ ایک مسلمان کا تو یہ شیوہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ قرآن وحدیث کی صورت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، اس کو دل وجان سے برحق تسلیم کرے اور اس پر ایمان لائے، جیسا کہ امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

على الله البيان وعلى الرسول البلاغ وعلينا التسليم .

”بیان کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ پہنچانا ہے اور سر تسلیم خم کرنا ہم پر لازم ہے۔“

(الترغیب لابن أبی عاصم ۷۱: حلیۃ الاولیاء للذہبی نعیم ۳۶۹/۳: عقیدۃ السلف أصحاب الحدیث)

لذہبی اسماعیل الصابونی: واللفظ له: تفلیح التعلیل لابن حجر: ۳۶۵/۵: وسندہ صحیح)

یہ تو ہوا مومنوں کا طیرہ، جبکہ گمراہ اور ظالم قرآن وحدیث میں ٹکراؤ پیدا کرنے کی مذموم کوشش کرتا ہے، اس طرح وہ متاع ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، قرآن وحدیث میں کوئی تعارض نہیں، ہاں! ظاہری طور پر تعارض موجود ہے، حقیقت

میں کوئی تعارض نہیں، اہل ایمان نور ایمان و علم سے تعارض کو رفع کر دیتے ہیں، جبکہ معاندین قصور فہم کی بنیاد پر گمراہی اور ضلالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔
حافظ خطابی لکھتے ہیں:

فانه يحذر بذلك مخالفة السنن التي سنّها رسول الله (صلى الله عليه وسلم) مما ليس له في القرآن ذكر على ما ذهب اليه الخوارج والروافض، فانهم تعلقوا بظاهر القرآن وتركوا السنن التي قد ضمنت بيان الكتاب فتحيروا وضلوا.

”رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ سنتیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں، ان کی مخالفت سے بچنا چاہیے، خارجیوں اور رافضیوں نے صرف قرآن کے ظاہر کو لیا ہے، جبکہ ان احادیث کو چھوڑ دیا ہے جو قرآن کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہیں، اس لیے وہ گمراہ ہو گئے ہیں۔“ (معالم السنن: ۴/۲۹۸)

بقیہ بن ولید (ثقہ عند الجہور) کہتے ہیں کہ امام اوزاعی نے مجھے فرمایا، ایسے لوگوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو اپنے نبی کی حدیث سے بغض رکھتے ہیں؟ میں نے عرض کی، وہ برے لوگ ہیں، آپ نے فرمایا:
ليس من صاحب بدعة تحدثه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم بخلاف بدعته ألا أبغض الحديث.

”جس بدعتی کو بھی آپ اس کی بدعت کے خلاف حدیث سنائیں گے، وہ اسے برا سمجھے گا۔“

(نرف اصحاب الحديث للخطيب: ۱۵۰، الحجۃ النبوی القاسم الأصبہانی: ۲۰۷/۱، وسندہ صحیح)

امام آجری فرماتے ہیں:

ينبغي لأهل العلم والعقل اذا سمعوا قائلًا يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم في شيء قد ثبت عند العلماء، فعارض انسان جاهل، فقال: لا أقبل الا ما كان في كتاب الله (عز وجل) قيل له: أنت رجل سوء وأنت ممن حذرناك رسول الله صلى الله عليه وسلم وحذر منك العلماء.

”اہل علم و عقل کو چاہیے کہ جب وہ کسی کو صحیح ثابت فرمان رسول بیان کرتے ہوئے سنیں اور کوئی جاہل انسان اسے سن کر یہ کہے کہ میں صرف قرآن کو مانتا ہوں، اسے کہا جائے کہ تو برا انسان ہے، تجھ جیسے لوگوں سے ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور علمائے کرام نے خبردار کیا تھا۔“ (النسریۃ: ۴۹)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا تخالف سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم كتاب الله بحال.

”کسی بھی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرآن کریم کے مخالف نہیں ہو سکتی۔“

(الرسالة للسافعي: ۵۶)

تحقیق شاطبی لکھتے ہیں:

التعارض اما ان يعتبر من جهة ما في نفس الامر ، واما من جهة نظر المجتهد ، اما من جهة ما في نفس الامر فيغير ممكن بلاطلاق...

”تعارض کی دو قسمیں ہیں، یا تو حقیقی ہوگا یا صرف مجتہد کی نظر میں ہوگا، (قرآن وحدیث میں) حقیقی تعارض بالکل ناممکن ہے۔“ (الموافقات: ۲۹۴/۴)

جولوگ یہ کہتے ہیں کہ حدیث قرآن پر پیش کرو، اگر قرآن کے موافق ہو تو لے لو، اگر مخالف ہو تو چھوڑ دو، ہمارا ان سے سوال ہے کہ جب قرآن قرآن سے ٹکرائے، اس صورت میں تم قرآن کی کس آیت کو لو گے اور کس کو چھوڑو گے؟ جو ان کا جواب ہوگا، وہی ہمارا قرآن وحدیث میں تعارض کے حوالے سے جواب ہو جائے گا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے:

لا ألفين أحدكم متكئا على أريكته، ياتيه الأمر من أمرى مما أمرت به أو نهيت عنه، فيقول: لا ندرى، ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه.

”میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ اپنے صوفہ پر ٹیک لگائے ہوئے ہو اور اس کو امر یا نہی کی صورت میں میرا فرمان پہنچے تو وہ کہے کہ ہم نہیں جانتے، ہم تو صرف قرآن کی اتباع کریں گے۔“

(أبو داود: ۴۶۰۵؛ ترمذی: ۲۶۶۳؛ ابن ماجہ: ۱۲؛ مسند الحمیدی: ۵۵۱؛ دلائل النبوة للبيهقي: ۵۴۹/۶؛ مسند صحیح)
اس حدیث کو امام ترمذی نے ”حسن صحیح“، نیز امام ابن حبان (۱۳) اور امام حاکم (۱۰۸/۱) نے ”صحیح“ کہا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، حافظ بغوی نے بھی اس کو ”حسن“ قرار دیا ہے۔ (شرح السنة: ۲۰۷/۱)

حافظ بغوی اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں: وفي الحديث دليل على أنه لا حاجة بالحديث الى أن يعرض على الكتاب ، وأنه مهما ثبت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان حجة بنفسه .

”یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حدیث کو قرآن پر پیش کرنے کی قطعی طور پر کوئی ضرورت نہیں، بلکہ جب وہ حدیث صحیح ہو تو بذات خود حجت شرعی ہوگی۔“ (شرح السنة: ۲۰۷/۱-۲۰۸)

قرآن اور حدیث کے مابین تعارض کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

متواتر حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انکم سترون ربکم کما ترون هذا القمر ، لا تضامون في رؤيته

”یقیناً تم قریب تم اپنے رب کو دیکھو گے، جس طرح بھیر کے بغیر چاند دیکھتے ہو۔“

(صحیح بخاری: ۷۴۳۴؛ صحیح مسلم: ۶۳۳)

قرآن مجید میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دیدار کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَنْ تَرَانِي﴾ (الاعراف: ۱۴۳) ”(اے موسیٰ!) آپ مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔“

حدیث پاک میں دیدار الہی کا ثبوت ہے اور قرآن پاک اس کی نفی کر رہا ہے، منکرین حدیث اس تعارض کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث ”صحیح“ نہیں، بالفرض اس کو ”صحیح“ مان لیا جائے تو اس سے مراد ”علم“ ہے نہ کہ دیدار الہی۔ بطور دلیل وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پیش کرتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مِنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (النور: ۲۱)

”کیا آپ کو علم نہیں کہ آسمان وزمین کی ہر چیز اس کی تسبیح کرتی ہے؟“

تو اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث متواتر ہے، اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں، قرآن نے جس دیدار الہی کی نفی کی ہے، اس کا تعلق دنیا سے ہے، حدیث پاک نے جس کا اثبات کیا ہے، اس کا تعلق آخرت سے ہے، یعنی دنیا میں کوئی آنکھ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی، البتہ آخرت میں وہ مومنوں کو اپنا دیدار دے گا، لہذا تعارض ختم ہوا، یہاں روایت کی تعبیر علم سے کرنا قرآن و حدیث اور صحابہ کرام و سلف صالحین کے متفقہ فہم و تصریحات کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَجُوَّهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۖ اِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (القیامہ: ۲۲-۲۳)

”اس دن (قیامت کو مومنوں کے) چہرے شکفتہ اور بارونق ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔“

نظری نسبت چہرے کی طرف کی گئی ہے، جو کہ آنکھوں کا محل ہے، اس کو ”الی“ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ یہ روایت بصری ہوگی نہ کہ قلبی، یہ اہل جنت پر اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہوگا اور جو منکر ہوگا، وہ اس سے محروم رہے گا۔

ان کی اس باطل تاویل کا رد اسی حدیث میں موجود ہے، جب صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روز قیامت ہونے والے دیدار الہی کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

هل تضارون في رؤية الشمس بالظهير صحوا، ليس معها سحب؟ وهل تضارون في رؤية القمر ليلة البدر صحوا، ليس فيها سحب؟ قالوا: لا، يا رسول الله! قال: ما تضارون في رؤية الله تبارك وتعالى يوم القيامة الا كما تضارون في رؤية أحدهما.

”جب سورج نصف النہار پر ہو اور اس کے ساتھ کوئی بادل بھی نہ ہو تو کیا تمہیں سورج دیکھنے میں کوئی دقت یا دشواری ہوتی ہے؟ اور جب چودھویں رات کو آسمان پر چاند جلوہ آرا ہو اور اس پر بادل بھی نہ ہو تو کیا چاند دیکھنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے؟ صحابہ نے عرض کی، نہیں، اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا، جس طرح تم دنیا میں سورج یا چاند کو دیکھتے ہو، اسی طرح روز قیامت اللہ تبارک و تعالیٰ کا دیدار کر لو گے۔“ (صحیح مسلم: ۱۸۲)

اس حدیث نے واضح کر دیا ہے کہ دیدار بصری ہوگا نہ کہ قلبی۔

امام ابن قتیبہ لکھتے ہیں:

ولو كان الله تعالى لا يرى في حال من الأحوال ولا يجوز عليه النظر، لكان موسى عليه السلام قد خفي عليه من وصف الله ما علموه.

”اگر کسی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار ناممکن ہو تو یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے جس وصف کو موسیٰ علیہ السلام

نہ جان سکے، اسے منکرین حدیث جان گئے۔“ (تاویل مختلف الحدیث: ۲۰۷)

منکرین حدیث کا خود ساختہ اصول باطل ہوا کہ حدیث کو قرآن پر پیش کیا جائے، اگر قرآن کے موافق ہو تو لے لی جائے اور اگر قرآن کے مخالف ہو تو چھوڑ دی جائے۔ خوب یاد رہے کہ کوئی صحیح حدیث قرآن کے مخالف نہیں ہوتی، ظاہری مخالفت ہو سکتی ہے، حقیقت میں کوئی مخالفت نہیں ہو سکتی، لہذا ایک صحیح، مرفوع اور متصل حدیث پیش کی جائے جو قرآن کے خلاف ہو، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم اس تعارض کو رفع کر دیں گے، اگر قرآن کا ظاہری تعارض رفع ہو سکتا ہے تو قرآن و حدیث کا ظاہری تعارض دور کیوں نہیں ہو سکتا؟ اگر دور نہ ہو تو یہ سمجھ کا قصور ہوگا۔

منکرین حدیث اس مرض میں مبتلا ہیں، شیطان ان کی طرف باطل القاء کرتا ہے، ان کی عقلیں سقیم اور فاسد ہو چکی ہیں، شبہات و وسوس کے اندھیروں سے ان کے سینے لبریز ہو چکے ہیں، ان کی دلیلیں جو درحقیقت شبہات ہیں، باطل ثابت ہو چکی ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی اس فرمان کے مصداق ہیں:

﴿وَمَنْ يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُّكْرِمٍ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ﴾ (العنکبوت: ۱۸)

”اور جسے اللہ ذلیل کرے، اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں، یقیناً اللہ جو چاہتا ہے، سو کرتا ہے۔“

نیز فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعَمَّى أَبْصَارَهُمْ﴾ (مائدہ: ۲۴)

”یہ (منکرین حدیث جو درحقیقت منکرین قرآن ہیں) وہ لوگ ہیں، جن پر اللہ نے لعنت کی ہے، پھر ان کو بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔“

حدیث جو حق ہے، اس کو نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں۔

تو ام السیّدہ امام ابوالقاسم اسماعیل بن محمد الاصہبانی نے کیا خوب لکھا ہے:

وقول من قال: تعرض السنة على القرآن، فان وافقت ظاهره، والا استسلمنا ظاهر القرآن وتركنا الحديث، فهذا جهل، لأن سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم مع كتاب الله عز وجل تقام مقام البيان عن الله عز وجل، وليس شيء من سنن رسول الله صلى الله عليه وسلم يخالف كتاب الله لأن الله عز وجل أعلم خلقه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم يهدي الى صراط مستقيم فقال: ﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (الشورى: ۵۲) وليس لنا مع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم من الأمر شيء الا اتباع والتسليم ولا يعرض على القياس ولا غيره، وكل ما سواها من قول الادميين تبع لها ولا عذر لاحد يعتمد ترك السنة، ويذهب الى غيرها، لأنه لا حجة لقول أحد مع رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا صح.

”منکرین حدیث کا یہ کہنا کہ سنت کو قرآن پر پیش کیا جائے گا، اگر وہ قرآن کے موافق ہوئی تو ٹھیک ورنہ ہم قرآن کے ظاہر کو لے لیں گے اور حدیث کو چھوڑ دیں گے، نری جہالت ہے، کیونکہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے موافق

ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے قرآن کی تفسیر و بیان اور تشریح ہے، کوئی سنت قرآن کے مخالف و معارض نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اس بات سے باخبر کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سیدھی راہ کی راہنمائی فرماتے ہیں، فرمایا: ﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (السورۃ: ۵۲) (آپ ضرور ضرور صراطِ مستقیم کی ارشاد و راہنمائی فرماتے ہیں)۔ ہمارے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و تسلیم کے بغیر کوئی چارہ نہیں، نیز حدیث کو قیاس وغیرہ پر بھی پیش نہیں کیا جائے گا، امتیوں کے اقوال و افعال تو حدیث کے تابع ہیں (اگر حدیث کے موافق ہوں تو لے لیں گے، ورنہ ترک کر دیں گے) کسی کے لیے جان بوجھ کر سنت کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف جانے کی گنجائش نہیں ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول صحیح ثابت ہو جائے تو اس کے خلاف کسی کا قول حجت نہیں ہے۔“ (العجۃ فی بیان الحجۃ: ۴۲۵/۲-۴۲۶)

اہل سنت کے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

من رد حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فهو علی شفا ہلکۃ .

”جس نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رد کر دیا، وہ بتابی و بربادی کے دہانے پر کھڑا ہے۔“

(العجۃ فی بیان الحجۃ: ۲۰۷/۸، مناقب الامام ابداللہ ابن الجوزی: ۱۸۲، وسندہ حسن)

تو ام النبیۃ ابواسمعیل الاصبہانی لکھتے ہیں:

”آدمی پر اہل بدعت سے بغض لازم ہے، وہ جہاں بھی ہوں، تاکہ وہ اللہ کی خاطر محبت اور اللہ کی خاطر بغض و نفرت کرنے والوں میں سے ہو جائے، اہل سنت سے محبت اور اہل بدعت سے بغض و نفرت کی کچھ علامات ہیں، جب کسی شخص کو آپ امام مالک بن انس، امام سفیان بن سعید الثوری، امام عبد الرحمن بن مہدی، امام عبد اللہ بن مبارک، امام محمد بن ادریس اشاعی اور دیگر صحیح العقیدہ ائمہ کرام رحمہم اللہ کا ذکر خیر کرتے دیکھیں، تو جان لیں کہ وہ اہل سنت میں سے ہے اور جب کسی کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین اور اس کی کتاب میں جھگڑا کر رہا ہے، اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے، جان لیں کہ وہ بدعتی ہے، جب کسی آدمی کو کہا جائے کہ تو حدیث کیوں نہیں لکھتا؟ وہ کہتا ہے کہ عقل بہتر ہے، جان لیں کہ وہ بھی بدعتی ہے، جب آپ دیکھیں کہ کوئی اہل فلسفہ و ہندسہ کی مدح سرائی کر رہا ہے، تو جان لیں کہ وہ گمراہ ہے، جب کسی کو دیکھیں کہ وہ اہل حدیث کو ”حشوئیہ، مشبیہ اور ناصبہ“ کہہ رہا ہو، تو جان لیں کہ وہ بدعتی ہے، جب کوئی صفات الہی کی نفی یا ان کو مخلوق سے تشبیہ دے رہا ہو، تو جان لیں کہ وہ گمراہ ہے۔“

(العجۃ فی بیان الحجۃ: ۵۳۹/۲-۵۴۰)

اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے: ﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (النساء: ۸۰)

”جس نے رسول کی اطاعت کی، درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“

یہ آیت کریمہ نص ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و احوال اللہ کی وحی ہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اللہ کی وحی کے تابع ہیں، تو ان کو قرآن کریم پر پیش کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں:

...فصح ان كلام رسول الله صلى الله عليه وسلم كله في الدين وحى من عند الله عز وجل ، لا شك فى ذلك ولا خلاف بين أحد من أهل اللغة والشريعة فى أن كل وحى نزل من عند الله فهو ذكر منزل .

”یہ لاریب حقیقت ہے کہ دین کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری باتیں وحی الہی ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کے منزل من اللہ ذکر ہونے میں لغت و شرع میں کوئی اختلاف نہیں۔“

(الاحکام لابن ہزم: ۱۳۵/۸)

حسان بن عطیہ تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کان جبریل ینزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالسنة كما ينزل عليه القرآن ويعلمه اياها كما يعلمه القرآن .

”جبریل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سنت کے لیے بھی نازل ہوتے تھے، جس طرح کہ قرآن کے لیے نازل ہوتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنت کی ویسے ہی تعلیم دیتے تھے، جس طرح قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔“

(السنة لمحمد بن نصر المروزي: ۱۱۶، ۲۸۰ وسنہ صحیح)

ابوالبقاء الحسینی الحنفی کہتے ہیں:

والحاصل أن القرآن والحديث يتحدان في كونهما وحيا من عند الله بدليل: ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾ (النجم: ۵)

”الحاصل، فرمان الہی: ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾ (النجم: ۵) کے مطابق قرآن و حدیث دونوں وحی ہونے میں متفق ہیں۔“ (کلیات ابی البقاء: ۲۸۸)

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

وقد اتفق من يعتد به من أهل العلم على أن السنة المطهرة بتشريع الأحكام ، وأنها كالقرآن في تحليل الحلال وتحريم الحرام .

”معتبر علمائے اسلام سنتِ مطہرہ کی مستقل تشریحی حیثیت پر متفق ہیں، یقیناً یہ حلال و حرام میں قرآن کی طرح ہے۔“

(ارشاد الفہم للشوکانی: ۳۳)

نیز فرماتے ہیں: ان ثبوت حجية السنة المطهرة واستقلالها بتشريع الأحكام ، ضرورة دينية ، ولا يخالف في ذلك الا من لا حظ له في دين الاسلام .

”سنتِ مطہرہ کی حجیت اور اس کا احکام شرعیہ کا مستقل مصدر ہونے کا ثبوت ضرورتِ دینی ہے، اس میں اختلاف

وہی کرتا ہے، جس کا دین اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔“ (ارشاد الفہم: ۳۳)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ۵۹)

”اے اہل ایمان! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔“

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دیا تو ”طیعوا“ کا صیغہ امر الگ الگ ذکر فرمایا، جب اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا، تو صیغہ امر نہیں دہرایا، بلکہ عطف پر اکتفا کیا، اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مستقل بالذات دلیل ہیں، لہذا آپ کی احادیث مبارکہ کو کتاب اللہ پر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ علامہ ابن القیم فرماتے ہیں:

فأمر تعالى بطاعته وطاعة رسوله ، وأما الفعل إعلاما بأن طاعة الرسول تجب استقلالاً من غير عرض ما أمر به على الكتاب ، بل إذا أمر وجبت طاعته مطلقاً ، سواء كان ما أمر به في الكتاب أو لم يكن فيه ، فإنه أوتي الكتاب ومثله معه .

”اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور اپنے رسول کی اطاعت کا حکم فرمایا، ”طیعوا“ کو دو بار ذکر کر کے یہ باور کروایا کہ حدیث کو قرآن پر پیش کیے بغیر اطاعت رسول مستقل شرعی مصدر و ماخذ ہونے کی حیثیت سے واجب ہے، بلکہ جب حکم دیا تو مطلق طور پر اطاعت رسول واجب ہوگئی، خواہ اس بات کا حکم کتاب اللہ میں ہو یا نہ ہو، یقیناً آپ کو قرآن عطا کیا گیا ہے اور قرآن کے ساتھ اس کی مثل ایک اور چیز (حدیث) بھی دی گئی ہے۔“ (اعلام الموقعین: ۴/۸۱)

مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر میں امام عطاء بن ابی رباح تابعی فرماتے ہیں:

أولو العلم والفقه ، وطاعة الرسول : اتباع الكتاب والسنة
 ”اولی الامر سے مراد علماء و فقہاء ہیں اور اطاعت رسول کتاب و سنت کی پیروی کا نام ہے۔“

(سنن الدارمی: ۳۳۵، تفسیر ابن جریر: ۱۶۷/۵، وسندہ صحیح)

قرآن و حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہو چکا ہے کہ حدیث وحی ہے، اس کو قرآن پر پیش کرنا گمراہی اور ضلالت ہے، نیز اس کا انکار کفر ہے۔

حافظ سیوطی فرماتے ہیں: ان من أنكر كون حديث النبي صلى الله عليه وسلم قولاً كان أو فعلاً ، بشرطه المعروف في الأصول حجة ، كفر و خرج عن دائرة الاسلام ، وحشر مع اليهود والنصارى أو مع من شاء الله من فرق الكفرة .

”حدیث قولی ہو یا فعلی، اسے شرعی دلیل سمجھتے ہوئے، جس نے بھی انکار کیا، وہ کافر ہے اور دائرہ اسلام سے خارج ہے، اس کا حشر یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہوگا یا ان کافر فرقوں کے ساتھ جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ چاہے گا۔“

(مفتاح الجنة فى الاحتجاج بالسنة : ۲)

حافظ ابو بکر انور پوری

سفر ہو تو ایسا!

پیارے بچو! سفر تو آپ بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن میں آج آپ کو ایک عجیب و غریب سفر کی داستان سنانا چاہتا ہوں، امید ہے کہ جہاں یہ واقعہ آپ کی معلومات میں اضافے کا سبب بنے گا، وہاں نہایت سبق آموز بھی ہوگا۔

صدیوں پرانی بات ہے، سخت گرمی کا موسم تھا، تین طالب علم قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اپنے علاقے کو خیر باد کہتے ہوئے سمندر پار جانے کے لیے روانہ ہوئے، وہ اس بات پر خوشی سے پھولے نہیں سارہے تھے کہ تین مہینوں کا راشن ساتھ لے کر جا رہے ہیں اور اب تو کئی ماہ مسلسل علم حاصل کر کے وہ اپنی علمی پیاس کو قدرے بجھا سکیں گے،

لیکن:

ہوتا ہے وہی جو منظور خدا ہوتا ہے

اس دور میں انجنوں کی مدد سے چلنے والے بحری جہاز تو ہوتے نہیں تھے، عام طور پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہوتیں جو ہوا کے رحم و کرم پر چلتی تھیں۔ اگر قدرتی طور پر ہوا منزل مقصود کی طرف چل رہی ہوتی تو مسافروں کی ”پانچوں گھی میں“ ہو جاتیں، لیکن خدا نخواستہ اگر ہوا مخالف سمت اختیار کر لیتی تو بسا اوقات کئی کئی ماہ مسافر سمندر میں ہی بھٹکتے رہتے اور کھانے پینے کا ختم ہونے یا راستہ بھول جانے کی وجہ سے آخر کار زندگی سے مایوس ہو جاتے۔ یوں سمندری لہروں کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

ان طلبہ کے ساتھ بھی ایسے ہی حالات پیش آئے۔ ان کی کشتی بھی مخالف ہوا کی بھیجت چڑھ گئی، لاکھ جتن کیے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پورے تین ماہ یہ ہوائی طوفان کشتی کو سمندر میں میں گھماتا پھراتا رہا، چند لقموں کے سوا سارا سامان خورد و نوش کام آچکا تھا۔ ان بے چاروں کے پاس دعاؤں اور التجاؤں کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، لہذا اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ ایک تو وہ تھے مسافر، دوسرے سفر بھی طلب علم کا تھا۔ ایسے مسافروں کے پاؤں میں تو فرشتوں جیسی مقدس مخلوق بھی اپنے نورانی پر بچھانا فرماتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ جو ”ارحم الراحمین“ ہے، اس کی رحمت جوش میں کیوں نہ آجاتی؟ دعا قبول ہوئی اور کشتی کنارے جا گئی، لیکن

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

اصل مصیبت کا آغاز اب ہوا۔ مشیت الہی کو ان کی آزمائش مقصود تھی اور وہ بھی اپنی ذہن کے ایسے پکے تھے کہ مصائب سے گھبرا کر علم کی راہ سے ہٹ جانا ان کے لیے مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ اس لیے بے سروسامانی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے انجام سے بے خبر منزل کی جانب بڑھنے لگے۔ بھوک لگی تو بچے کچھ چند لقمے جو پاس تھے، وہ بھی نگل لے لے۔

اب نہ کھانے کو کچھ تھا نہ پینے کو، سورج کی گرم لہروں اور صحرا کی تپتی ریت جہنم کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ سارا دن چلتے چلتے گزر گیا۔ دور دراز تک کسی چرند پرند کا نام و نشان تک نہ تھا، سوائے موت کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن کھانے کی قلت اور پیاس کی شدت ان کے پایہ استقلال میں لرزش پیدا نہ کر پائی۔ رات ہوئی تو ایک جگہ سو گئے۔ اگلے دن پھر منزل کی طرف

رواں دواں رہے۔ اب تو زبانیں خشک ہو چکی تھیں اور قدم ڈمگانے لگے تھے، پھر سارا دن یوں ہی گزرا۔ رات ہوئی تو ایک جگہ گر گئے۔

کئی دنوں کی مسلسل بھوک اور پیاس نے ان کو کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔ تیسرا دن تو گویا ان کے لیے قیامت ثابت ہوا۔ ان کی حالت اتنی دگرگوں ہو گئی کہ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک طالب علم بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ذرا اندازہ کریں کہ بھوک پیاس نے اگر باقی دو ساتھیوں کے پلے کچھ چھوڑا ہوتا تو وہ اسے سنبھالتے۔ ان کو تو اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس دھچکے کے بعد وہ اپنی موت کو اور قریب دیکھنے لگے تھے۔ اسے وہیں چھوڑ کر دونوں پانی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، تھوڑی دور گئے تھے کہ دوسرا بھی گرمی اور پیاس کی تاب نہ لاتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔ اس اکیلے ساتھی کی مصیبت کا ذرا تھوڑا کر کریں جو اپنے دونوں دوستوں کو گرمی اور پیاس سے تڑپ کر گرتا ہوا دیکھ تو سکتا تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد اس کے اپنے حواس بھی جواب دینے لگے تھے، لیکن پھر بھی ہمت کر کے ادھر ادھر پانی کی تلاش میں دوڑنے لگا۔

پھر وہی ہوا جو ہمیشہ سے سنت الہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ اپنے دین کے طالبوں اور خادموں کو آزماتا ضرور ہے، لیکن کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ ان کو تھنھوڑتا ضرور ہے، لیکن کبھی ناکامی و نامرادی کا منہ نہیں دکھاتا۔ اس کا وعدہ جو ہے: ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ﴾ (الحج: ۴۰)

”جو اللہ کے دین کے خادم ہوتے ہیں، اللہ ان کی ضرورت اور مدد فرماتا ہے۔“

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الروم: ۴۷)

دین کے ان جاں نثار طالب علموں کے مومن ہونے میں کس کوشش ہو سکتا ہے؟ نیز آنے والے دنوں میں اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کا بہت بڑا کام لینا تھا، لہذا اللہ تعالیٰ کی مدد آنجی۔ اپنے دوستاقتیوں کی زندگی بچانے کے لیے نکلنے والا اکیلا طالب علم اچانک ایک قافلے کو دیکھتا ہے۔ اسے زندگی کی ہلکی سی کرن محسوس ہوئی، چنانچہ اپنا کپڑا ہلا کر ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔ قافلے والوں نے اسے دیکھا تو ٹھہر گئے۔ گرمی اور پیاس اس پر بھی اپنا کام کر چکی تھی، قریب تھا کہ یہ بھی گر جاتا۔ انہوں نے اسے پانی پلایا۔ جب جان میں آئی تو ان کو لے کر اپنے ساتھیوں کی طرف دوڑا۔ پہلے ایک تک پہنچا اور اسے پانی کے چھینٹے مارے، کچھ ہوش و حواس بحال ہوئے تو تھوڑا تھوڑا کر کے پانی پلایا، پھر دوسرے کے پاس دوڑے دوڑے گئے اور اسے بھی پانی پلا کر ہوش میں لائے، پھر قافلے نے ان پر ترس کھایا اور کچھ سامان خورد و نوش ان کو مہیا کیا۔

اسی سفر میں ان کو بھوک کی وجہ سے ایک مردہ جانور کے انڈے پی کر بھی اپنی جان بچانا پڑی تھی۔

لیکن بھوک پیاس اور گرمی کی اتنی صعوبتیں اٹھانے کے بعد کیا وہ اپنے مشن سے دستبردار ہو گئے تھے؟ ہرگز نہیں! علم کی راہ میں ملنے والے یہ مصائب و آلام ان کو اس راہ سے ایک قدم بھی دور نہ کر سکے، بلکہ ان کے شوق میں اور اضافے کا سبب بن گئے، چنانچہ وہ ایک بار پھر نئے دلوں سے طلب علم کے لیے روانہ ہو گئے۔

(تقدمة الجرع والتعديل : ۳۶۶-۳۶۵-۳۶۴، وسنده صحيح)

یہ (۲۱۴) ہجری کا واقعہ ہے، یعنی اسے رونما ہوئے قریباً بارہ سو برس بیت چکے ہیں، لیکن آج بھی دین کے ان شیدائی طلباء کے یہ کارنامے کتابی صورت میں اہل علم کے سامنے ہیں اور قیامت تک وہ انہیں اپنے لیے مشعلِ راہ بناتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ

ان طلبہ میں سے ایک کو ”امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جو اپنے دور کے بہت بڑے محدث ہوئے اور علم حدیث میں ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیے کہ بعد میں آنے والے ان کو فراموش کر کے حدیث کے میدان میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔

آپ امام بخاری اور امام ابو زرعہ الرازی کے ہم عصر، امام احمد بن حنبل کے شاگرد اور امام ابو داؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ اور دیگر بڑے بڑے محدثین کے استاذ تھے۔ تمام ائمہ کرام نے بالاتفاق ان کی تعریف و توثیق کی ہے۔

آپ کی زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ یہ بھی ہے کہ دوران سفر زوارہ ختم ہونے پر مزید علم دین حاصل کرنے کے لیے اپنے کپڑے بیچ کر بھی کڑا رہ کیا تھا۔ (تقدمة الجرع والتعديل : ۳۶۴، وسنده صحيح)

ہے کوئی طالب علم جو دنیا اور آخرت کی سعادتوں کو حاصل کرنے کے لیے آج بھی اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ کرتے ہوئے طلب علم کی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنا یہ وعدہ پورا کرے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت : ۶۹)

”اور جو لوگ ہمارے (دین کے راستے) میں محنت کرتے ہیں، ہم ضرور ضروران کو اپنے (کا میابی و کامرانی والے) راستے دکھاتے ہیں۔“

کیا آپ تیار ہیں؟



داعی منڈوانا مجوسیوں کا کام ہے

الوسعید

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

انهم يوفون سبأهم ويحللون لحاهم ، فخالقوهم .

”وہ موچھیں بڑھاتے ہیں اور داڑھیاں منڈواتے ہیں، تم ان کی مخالفت کرو۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ : ۵۶۷/۸، الاوسط للطبرانی : ۱۶۴۵۰۱۰۵، السنن الکبریٰ للبیہقی : ۱۵۷/۱)

نعب الابسان للبیہقی : ۶۰۳۷، وسنده صحيح)

امام ابن حبان (۵۴۷۲) نے اس حدیث کو ”صحیح“ کہا ہے۔

اس کا راوی معتقل بن عبید اللہ الجزری ”حسن الحدیث“ ہے۔